قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1982

اس پرچہ میں

خوف و حزن

(قاطع رگ حیات)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک -/۸۶ "	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۵	دسمبر ۱۹۸۲ء	شمارہ ۱۲

فہرست

۱- لمعات ——— (ناموں سے حقیقت کی تبدیلی) ---------- ۲

۲- اسلام، دورِ ملوکیت میں (قسط نمبر ۲) ---------- ۶

۳- خوف ——— (ایک حقیقت کشا بصیرت افروز مقالہ) ---------- ۱۷

——— (محترم پرویز صاحب) ———

۴- نوید جانفزا ——— (مطالبُ الفرقان، جلد پنجم بھی شائع ہو گئی) ---------- ۴۸

۵- بابِ المراسلات ——— (۱) "پہلا کمیونسٹ"۔ (۲) ہماری نکبت اور زبوں حالی ---------- ۴۹

۶- حقائق و عِبر ——— (۱) طلاق کے متعلق فتویٰ ---------- (۲) ۶۵ من عرقِ گلاب (مزار کے غسل کے لئے)

——— (۳) عاشورہ محرم کا روحانی پہلو ——— (۴) بائیبل میں جدید تحریف ———

——— (۵) ایران، عراق، جنگ ——— (۶) اسلامی جمعیتِ طلبہ کا اجتماع ———

——— (۷) سعودی عرب کے شاہزادوں کے مشاغل! ——— (۸) جرائم کی تشہیر ———

——— (۹) ملایا میں اسلام! ——— (۱۰) عدل کی قرآنی تفسیر ---------

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالحمید مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ: اشرف پرنٹنگ پریس ۹ ایبک روڈ۔ لاہور۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لمعات

پرویز صاحب کے ہفتہ واری درسِ قرآنِ مجید کے سلسلہ میں، آجکل سورۃ والنجم (۵۳) زیرِ تدریس ہے۔ یوں تو قرآن کی کونسی سورت، بلکہ کونسی آیت ہے جو بے مثل و بے نظیر نہیں، لیکن بعض سورتیں، اپنے مخصوص موضوع کے اعتبار سے بے حد وسیعُ المطالب اور عمیق المعانی واقع ہوئی ہیں۔ سورۃ والنجم کا شمارہ انہی میں ہوتا ہے۔ اس میں مقامِ نبوّت جیسی فوق الادراک حقیقت کو، دو درجار چار الفاظ پر مشتمل آیات کی رُو سے جس حسنِ ایجاز سے سمجھایا گیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن اس وقت ہمارے پیشِ نظر اس میں بیان فرمودہ ایک اور نکتہ ہے جس کا (بظاہر) تعلق قریش جیسی بت پرست قوم کی توہم پرستی سے ہے لیکن جس کا اطلاق پوری کی پوری نوعِ انسان کی عالمگیر فریب خوردگی پر ہوتا ہے۔ اس میں، وحی جیسے سرچشمۂ علم و حکمت کی رفعتوں کو سامنے لانے کے بعد کہا گیا ہے کہ ایک طرف ان بلندیوں کو دیکھئے اور دوسری طرف انسان کی ان پستیوں کو کہ...... یہ پتھر کے چند ٹکڑوں کو اپنے ہاتھ سے تراشتا ہے اور پھر ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ یہ لات و منات و عزّیٰ اس سے زیادہ ہیں کیا؟ لیکن تمہیں علم ہے کہ ان پتھر کے ٹکڑوں کی مزعومہ الوہیت کا راز کیا ہے؟ فرمایا۔

اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ...... (۵۳/۲۳)

ان پتھر کے ٹکڑوں کے کچھ نام رکھ لئے گئے ہیں ــــ تم نے رکھ لئے ہیں یا تمہارے آباؤ اجداد نے۔ ان کی خدائی کا راز ان کے ناموں میں ہے۔

یہ ہے وہ عالمگیر فریب جس میں نوعِ انسان مبتلا چلی آ رہی ہے۔ پتھر کا ٹکڑا، پہاڑوں میں پڑا تھا تو وہ محض پتھر تھا ــــ بے جان۔ بے حس و حرکت جو اپنی جگہ سے خود ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ تم نے اس کا نام لات رکھ دیا تو وہی پتھر کا ٹکڑا خدا بن گیا۔ اگر اس سے یہ نام الگ کر لیا جائے تو یہ پھر وہی پتھر کا پتھر رہ جائے۔ اسے حریمِ کعبہ (یا مندر) سے اٹھا کر کسی ویرانے میں پھینک آیئے جہاں کوئی اس کے نام سے واقف نہ ہو، تو اس کی الوہیت ختم ہو جائے گی اور باقی وہی رہ جائے گا جو کچھ یہ فی الحقیقت ہے۔

آپ نوعِ انسان کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ یہ شروع سے اخیر تک انہی اسماء (ناموں) کی فریب خوردگی کی داستان نظر آئے گی ــــ خواہ وہ اس کے عہدِ طفولیت کا انسان ہو جب جہالت عام تھی، اور خواہ عصرِ حاضر کے دورِ شعور کا انسان جب تہذیب و تمدّن کا چرچا عام ہے۔ اس کی محسوس مثال کے لئے آپ اپنے ہمسایہ ملک (بھارت) پر نگاہ ڈالئے۔ اس کی ہر پرستش گاہ (مندروں) میں پتھروں کے ٹکڑے نصب دکھائی دیں گے جن کے، برہما، وشنو، شو، رام، کرشن...... نام رکھ دیئے گئے تو ان کی پرستش ہونے لگی۔ دوسری

سمت فطرت کی قوتوں کے مظاہر، بجلی۔ بادل۔ بارش۔ دریا۔ پہاڑ۔ چاند۔ سورج۔ زمین۔ حتیٰ کہ گائے، بیل وغیرہ کو دیوی اور دیوتا کہہ کر پکارا گیا تو وہ ان کے مسجود و معبود قرار پا گئے۔ بادل کو بادل کہیئے تو وہ فضا میں تیرنے والے ابخرات کا مجموعہ ہے۔ اسے اندر دیوتا کہہ دیجئے تو وہ معبود بن جاتا ہے۔ اس کی ساری تقدیس اس نام میں ہے۔ گائے اور بھینس دونوں حیوان (مویشی ہیں)۔ انہوں نے گائے کو ماتا کہہ دیا تو وہ معبود بن گئی۔ بھینس کا نام نہ بدلا تو وہ حیوان کی حیوان رہی۔

ہم ان مثالوں کو دیکھ کر (یا پیش کر کے) مطمئن ہو جاتے ہیں کہ لات، و منات کے پرستار، زمانہ جاہلیت کے عرب تھے، اور شوجی اور برہما کے بتوں کے پجاری، ہندو۔ ہم اس توہم پرستی کے طلسم کے شکار نہیں لیکن سطح سے ذرا نیچے اُتر کر دیکھئے تو صاف نظر آئے گا کہ اسماء کی پرستش کے نقطۂ نگاہ سے ہم بھی ان سے کم نہیں۔ کسی ویرانے میں مٹی کا ایک ڈھیر ہو تو وہ محض ایک قبر ہے۔ اسی ڈھیر کو کسی "ولی اللہ" کے نام کے ساتھ منسوب کر دیجئے تو وہ مرجع خلائق اور معبودِ عوام بن جائے گا۔ یہ بڑے بڑے آستانے اور درگاہیں اسی لئے مقدس اور متبرک ہیں کہ انہیں بڑے بڑے مقدس اور متبرک ناموں کے ساتھ منسوب کر دیا گیا ہے۔ اگر ان سے یہ نام چھین لئے جائیں تو یہ بھی دوسرے مزاروں کی طرح عام مزار رہ جائیں۔ اس سے واضح ہے کہ... پتھر کے تراشیدہ ٹکڑوں کی طرح، مرمر کی یہ سلیں یا چونے اور اینٹ کے یہ ڈھیر اپنی ذات میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کی اہمیت ان ناموں کی وجہ سے (اضافی) ہے جن سے انہیں موسوم کر دیا جاتا ہے۔ اس سے کسی شے کی ذاتی اہمیت (یا حقیقت) اور اضافی اہمیت کا فرق سامنے آ گیا۔ انسان کی خود فریبی کی وجہ یہ ہے کہ یہ اضافی اہمیت کو ذاتی اہمیت سمجھ لیتا ہے۔ یہ شے کی حقیقت کو نہیں دیکھتا۔ اس حقیقت کو، نام کا جو لباس پہنا دیا جاتا ہے، اسے حقیقت سمجھ لیتا ہے حضور نبی اکرمؐ کی یہ دعا کس طرح درخشندہ گوہر کی طرح تابناک ہے کہ "بارالٰہا! میری نگاہ کو وہ صلاحیت عطا فرما دے کہ وہ ہر شے کو، جیسی کہ وہ فی الحقیقت ہے، دیکھ سکے"۔ وحیٔ خداوندی، انسان کو وہ نگاہ عطا کر دیتی ہے جس سے وہ ناموں کے طلسم میں نہیں اُلجھتا بلکہ ہر شے کی حقیقت کو دیکھ لیتا ہے جس زمانے میں قائدِ اعظمؒ اور (مسٹر) گاندھی کے مذاکرات ہو رہے تھے تو مسٹر گاندھی نے قائدِ اعظمؒ سے کہا تھا کہ مجھے اس الجھن سے نکال دیجئے کہ میں آپ کو کس نام سے مخاطب کروں ــــ قائدِ اعظمؒ کہوں۔ جناح صاحب کہوں۔ مسٹر جناح کہوں۔ قائدِ اعظمؒ نے جو کچھ اس کے جواب میں کہا تھا اس سے حقیقت اور اضافی نسبتوں (اسماء) کا فرق نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ گاندھی صاحب! آپ مجھے جس نام سے جی چاہے پکار لیجئے۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ پھول، پھول ہی ہے، اس کا کوئی نام رکھ دیجئے۔ اگر وہ پھول ہے تو نام کے بدلنے سے اس کی حقیقت اور ماہیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ لیکن اگر وہ پھول نہیں، تو اُسے ہزار بار پھول کہنے سے بھی وہ پھول نہیں بن سکتا۔

اسے ایک اور مثال سے سمجھئے۔ پانی اپنی ایک حقیقت رکھتا ہے۔ اگر وہ فی الواقعہ پانی ہے تو اسے پانی کہیئے۔ واٹر کہیئے۔ آب کہیئے۔ ماء کہیئے۔ جل کہیئے۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اگر وہ درحقیقت پانی نہیں، کچھ اور ہے تو ان الفاظ (اسماء) میں سے کسی لفظ سے پکار لیجئے، وہ پانی نہیں بن جائے گا۔

ہمارا دور جسے دورِ تہذیب و تمدن کہا جاتا ہے، درحقیقت دورِ منافقت ہے (اقبالؒ) اسی لئے اسے "جھوٹے نگوں

کی ریاکاری" کہہ کر پکارتا ہے) اس میں اسماء (الفاظ) کی چمک اس طرح نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے کہ وہ حقیقت تک پہنچنے کے قابل ہی نہیں رہتی۔ اس دور میں ایک نئی زبان وضع ہوئی ہے جسے (DIPLOMATIC LANGUAGE) کہا جاتا ہے۔ اس میں الفاظ تو مروجہ زبان ہی کے ہوتے ہیں لیکن ان کے معانی وہ نہیں ہوتے۔ اس میں منافقت کا نام ڈپلومیسی، ریاکاری کا نام سیاست گری، اصول شکنی کا نام حکمتِ عملی، وعدہ فراموشی کا نام مصالحت کوشی، دھوکا دہی کا نام ہنرمندی، استحصال کا نام کاروبار، حبیب تراشی کا نام تجارت، سود کا نام منافع، سرمایہ کاری کا نام مضاربت، ہر قسم کے باطل طریق کا نام "اضطراری حالت" (جس میں سور کھانا جائز قرار پا جاتا ہے)۔ یہ تو اوپر کی سطح کی باتیں ہیں۔ نیچے اتر آیئے اور اپنی روزمرہ کی زندگی کی طرف آیئے تو اس میں کوئی چیز بھی درحقیقت وہ نہیں ہوتی جس نام سے وہ رائج ہوتی ہے۔ آپ کو جو چیز گیہوں کے آٹے کے نام سے ملتی ہے، اس کا نام گیہوں کا آٹا ہوتا ہے۔ وہ درحقیقت گیہوں کا آٹا نہیں ہوتا۔ آپ کو جو چیز دودھ کے نام سے مہیا کی جاتی ہے وہ درحقیقت دودھ نہیں ہوتا۔ ان دو ایک مثالوں کی روشنی میں آپ ان اشیاءِ ضروریہ کا خود تجزیہ کرتے جایئے جو صبح سے شام تک آپ کو ملتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ درحقیقت وہ نہیں ہوتیں جن ناموں سے انہیں پکارا جاتا ہے حتیٰ کہ شیشی کے اوپر لیبل پر جو نام لکھا ہوتا ہے، شیشی کے اندر وہ دوائی نہیں ہوتی۔ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے دورِ تہذیب و تمدن میں اسماء کے فریب نے کس قدر روشِ عام اختیار کر رکھی ہے۔

لیکن اشیاءِ مستعملہ سے آگے بڑھ کر اگر آپ ایک اور مقام کو سامنے لائیں جہاں قرآن کریم نے حقیقت اور نقاب پوشی کے فرق کو نمایاں کیا ہے تو ایک اور عظیم نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت یوسفؑ اپنے قید خانہ کے ساتھیوں کو حقیقت اور تصنع کا فرق سمجھاتے ہیں۔ وہ فرعونِ مصر کی شخصی حکومت کے تابع زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ ..... (۱۲/۴۰)

جن کی تم نے محکومیت اختیار کر رکھی ہے ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ چند نام ہیں جو تم نے یا تمہارے آباء و اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں۔

جنہیں تم حکمران کہتے ہو، انہیں درحقیقت حقِ حکومت حاصل نہیں۔ تم انہیں حکمران کہتے ہو، تو یہ حکمران بن جاتے ہیں۔ تم ان کی حکمرانی تسلیم نہ کرو، تو یہ تمہارے جیسے انسان رہ جائیں گے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط ..... (۱۲/۴۰) حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ط ..... (۱۲/۴۰)۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کو حاکم تسلیم نہ کرو، کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ اس لئے کہ جو درحقیقت حاکم نہیں، اس کا اپنے آپ کو بحیثیت حاکم پیش کرنا فریب دہی ہے، اور اسے حاکم تسلیم کرنا فریب خوردگی۔ یہ حاکم نہیں۔ پتھر کے بت ہیں جن کا تم نے نام "خدا" رکھ لیا ہے۔ حاکم صرف خدائے حقیقی ہے۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری! (اقبالؒ)

نہ ان کا نام حکمران رکھنے سے یہ فی الحقیقت حکمران بن سکتے ہیں، نہ تمہارا نام محکوم رکھنے سے تم محکوم ہو جاتے ہو۔ ان ناموں کو الگ کر دو تو تم اور یہ دونوں انسان رہ جاتے ہو جن کی حیثیت یکساں ہے۔ حکمران صرف خدا ہے۔ وہ اس لئے حکمران نہیں کہ تم نے اسے حکمران کہنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اپنی ذات میں حکمران ہے۔ وہ اُس وقت بھی خدا تھا جب

اسے خدا کہہ کر پکارنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ اس وقت بھی خدا ہوگا جب اُسے خدا ماننے والا (کرۂ ارض پر) کوئی نہیں رہے گا۔ اس نے اپنا تعارف اپنی مختلف صفات کی رُو سے کرایا ہے۔ انہیں وہ..... اسماؤ الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے۔ اُسے تم اِن اسماء میں سے کسی اسم سے بھی پکارو، اس سے اس کی ذات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى..... (۱۷/۱۱۰)

یوں تو اسماء کے فرق نے (یعنی کسی شے کا وہ نام رکھ دینے سے جو وہ درحقیقت نہیں) ہر زمانے میں مضرت رساں اثرات مرتب کئے ہیں لیکن ہمارے زمانے میں اس کے نقصان رساں نتائج بڑے شدید ہو گئے ہیں۔ اسلام آیا تو اس نے اپنا نظام قائم کیا جس کے پروگرام کے مختلف اجزاء اور عناصر کے مختلف نام تھے ــــ الدین ــــ نظام صلوٰۃ ــــ صوم ــــ زکوٰۃ ــــ حج ــــ اسلامی قوانین ــــ اسلامی شریعت ــــ اسلامی نظام ــــ اسلامی مملکت (یعنی خلافت جس کی بنیاد مشاورت تھی اور جس کا فریضہ کتاب اللہ کے احکام و اقدار کا نفاذ تھا) وغیرہ وغیرہ ــــ وہ دور ختم ہو گیا تو اسلامی نظامِ مملکت کی جگہ ملوکیت نے لے لی۔ دین کی اس اصل کے بدلنے سے اس کی جملہ فروعات کی حقیقت بھی بدل گئی۔ ملوکیت نے ان الفاظ کو علیٰ حالہٖ قائم رکھا لیکن ان کے مفہوم اور مقصود کو بدل دیا ــــ مسلمان قوم کی سلطنت کا نام اسلامی مملکت قرار پا گیا۔ اس مملکت کے وضع اور رائج کردہ احکام و قوانین کو اسلامی احکامِ شریعت کہہ کر پکارا گیا۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ وغیرہ کی ظاہر اہمیت ہی کو حقیقت پر محمول کر دیا گیا۔ اس طرح اسلام ــــ دین کی جگہ ــــ مذہب بن گیا۔ اب تک یہ چیزیں (جن کی حقیقت کچھ اور تھی لیکن جن کا صرف نام اسلامی رکھ دیا گیا تھا) ہمارے ہاں نجی طور پر رائج چلی آ رہی تھیں۔ لیکن اب انہیں قانونی حیثیت دی جا رہی ہے۔ اس کا نقصان کیا ہے، اسے ایک پیش پا افتادہ مثال کی رُو سے سمجھئے۔ ہمارے ملک میں (دیسی) گھی استعمال ہوتا تھا۔ گھی اسی کو کہا جاتا تھا کسی اور چیز کو نہیں جب ڈالڈا چلا ہے تو اسے ڈالڈا (بناسپتی) کہا جاتا تھا۔ گھی نہیں۔ گھی کے مقابلہ میں اس کی حیثیت یہ تھی کہ کوئی وضع دار آدمی اسے کھلے بندوں بازار سے خریدتا نہیں تھا۔ اس صنعت کے کاروبار کرنے والوں نے اس کا نام گھی رکھنا شروع کر دیا۔ اب کیفیت یہ ہے کہ حقیقی گھی تو نایاب ہو گیا ہے اور وہی ڈالڈا گھی کے نام سے موسوم ہو گیا ہے۔ اب جو آپ "گھی" کہیں گے تو اس سے مراد ڈالڈا ہوگا، حقیقی گھی نہیں۔ قوم کے بڑے بوڑھے تو ان دونوں میں فرق کرتے ہیں لیکن ان کے بعد آنے والی نسلوں کے تصور میں بھی یہ فرق نہیں آ سکے گا۔ ان کی زبان اور لغت دونوں میں "گھی" سے یہی ڈالڈا مراد ہوگا۔ اس نسل کا نوجوان اگر کسی پرانی کتاب میں "گھی" کے فوائد پڑھے گا تو وہ بالساختہ کہے گا کہ یہ سب جھوٹ ہے، کیونکہ اسے جو کچھ گھی کے نام سے دیا جا رہا ہے اس کے خواص، اس (گھی) سے بالکل مختلف ہیں۔ ہمارا مروّجہ اسلام، درحقیقت ڈالڈا ہے جس کا نام گھی رکھ دیا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس کی پہچان کیا ہے کہ یہ ڈالڈا ہے گھی نہیں۔ قرآن کریم نے جہاں اسماء (ناموں) کی فریب کاری کا ذکر کیا ہے وہیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان دونوں میں فرق کیسے کیا جا سکے گا۔ فرمایا کہ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ۔ (۵۳/۲۳، ۱۲/۴۰، ۷/۷۱) انہیں قرآن کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو۔ جسے یہ خالص اور حقیقی اسلام کہہ دے، وہ اسلام ہے۔ جسے اس کی تصدیق اور توثیق حاصل نہ ہو، وہ غیر اسلامی ہے۔

(۰)

اسلام — دورِ ملوکیت میں

(قسطِ دوم — غلام اور لونڈیاں)

باندیوں کی تعلیم و تربیت

عباسیوں نے باندیوں کو تعلیم دینے پر —— ان کی مختلف انواع کے مطابق —— خصوصی توجہ سے کام لیا۔ وہ زیادہ تر انہیں گانے بجانے کی تعلیم دیتے تھے۔ گانا بجانا ان کے عہد میں بہت زیادہ پھیل گیا تھا بلکہ انسان کی بنیادی ضروریات میں سے شمار ہونے لگا تھا۔ گانے والے، اور گانے والیاں پبلک مقامات، سڑکوں، خلفاء کے محلات، مالداروں اور فقیروں کے مکانات غرضیکہ ہر جگہ نظر آتی تھیں۔ لوگوں کا ذوق گانے بجانے میں حیرت ناک طریقہ پر بڑھتا جارہا تھا۔ کتابیں اس کی حکایتوں اور تذکروں سے بھری پڑی ہیں۔ لوگوں کو گانے بجانے کا اتنا شوق ہو گیا تھا کہ کوئی گویّا کسی پل پر گانا شروع کر دیتا تو لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور یہ ڈر ہونے لگتا کہ کہیں پل ہی نہ ٹوٹ کر گر جائے[1] اور کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ عمدہ گانے کے اثر سے مسحور ہو کر لوگ ستونوں کے ساتھ ٹکریں مارتے تھے[2] خود خلفاء اور ان کی اولاد بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی کہ —— نئے نئے سُر نکالیں اور ان میں گائیں —— چنانچہ صاحب اغانی کا بیان ہے کہ واثق

---

[1] اغانی صفحہ ۱۲۷ جلد ۱۸۔

[2] 〃 〃 ۱۵۶ 〃 ۱۵۔

اور معتصم دونوں خلیفہ نہایت خوش آواز تھے اور دونوں گاتے تھے اور بہت عمدہ گاتے تھے[1] انہوں نے اس موضوع سے متعلق ایک طویل اور مستقل باب باندھا ہے جس میں بتایا ہے کہ خلفاء کی اولاد نے گانے کے فن میں کیا کیا کاریگریاں دکھائی تھیں [2] عُلَیَّۃ کو جو خلیفہ مہدی کی صاحبزادی ہیں تھوڑے راگوں پر قدرت حاصل تھی۔ احمد بن داؤد قاضی کا بیان ہے کہ میں گانے کو بہت ناپسند کرتا اور گانے والوں پر طعن و تشنیع کیا کرتا تھا۔ ایک دن معتصم شماسیہ کی طرف نکل گئے ان کے ساتھ تعیش و تنعم کے پورے ساز و سامان تھے۔ انہوں نے شراب نوشی شروع کی اور میری تلاش میں آدمی بھیجا۔ میں پہنچا۔ میں ذرا قریب پہنچا تو گانے کی آواز سنی۔ اس گانے نے مجھے وارفتہ کر دیا اور ہر چیز سے بے خبر بنا دیا حتیٰ کہ کوڑا میرے ہاتھ سے گر گیا۔ میں اپنے غلام کی طرف متوجہ ہوا کہ اس سے اس کا کوڑا مانگ لوں۔ اس نے مجھے بتایا کہ بقسم! میرا کوڑا ابھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آخر تمہارا کوڑا کیوں ہاتھ سے گر گیا؟ وہ کہنے لگا کہ میں ایک ایسی آواز سن رہا ہوں جس نے مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر بنا دیا ہے۔ چنانچہ اس عالم بے خبری میں کوڑا میرے ہاتھ سے کہیں گر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس پر بھی بعینہٖ وہی اثر ہوا ہے جو مجھ پر ہوا تھا۔ قاضی احمد بن داؤد فرماتے ہیں کہ میں گانے کے ساتھ سازوں کے استعمال کو بہت ہی برا سمجھتا تھا کیونکہ وہ لوگوں کو وارفتہ کر دیتے اور ان کی عقلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ میں اس سلسلہ میں معتصم سے مناظرے کیا کرتا تھا جب میں اس کے حضور میں اس دن حاضر ہوا تو میں نے اس دن کا واقعہ اسے سنایا جسے سن کر وہ بہت ہنسا اور کہنے لگا کہ یہ میرے چچا مجھے گا گا کر شعر سنا رہے تھے جس سے تم اتنے مسحور ہو گئے۔ شعر کا ترجمہ یہ ہے۔

خاندان حفص کے اس لمبے آدمی نے بزرگی اور عظمت کو پھیلا دیا ہے اس کے بعد کہ وہ مردہ ہو گئی تھی۔

اگر تم نے اپنے مناظروں سے توبہ کر لی ہو جو تم گانے کی مذمت میں ہم سے کرتے رہتے ہو تو میں ان سے درخواست کروں کہ وہ اس شعر کو دوبارہ گائیں۔ چنانچہ میں نے توبہ کی اور انہوں نے وہ شعر دوبارہ گایا۔ میں اس سے کہیں زیادہ مسحور ہو گیا جتنا میں دوسروں کے متعلق سنا کرتا اور اس پر اعتراض کیا کرتا تھا۔ اس دن سے میں نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا[3]

گانے کے ساتھ اس شغف نے ان لوگوں کو اس پر راغب کیا کہ وہ باندیوں کو گانے کی تعلیم دلائیں، تاکہ جہاں ان کا حسن و جمال جنت نگاہ ہو ساتھ ہی ان کا گانا بھی ان کے لئے فردوس گوش بن سکے۔ گانا سیکھنے کے ساتھ ساتھ انہیں عربی ادب بھی سیکھنا پڑتا تھا کیونکہ لوگ ان دنوں زیادہ تر عربی کے فصیح و بلیغ اشعار ہی گانے میں پسند کرتے تھے مثلاً عمر بن عربی ربیعہ، بشار بن برد، مسلم بن الولید اور ابو العتاہیہ وغیرہ کے اشعار۔ گانے والی ان کے اشعار کو اس وقت تک کامیابی کے ساتھ نہیں گا سکتی تھی جب تک اس قسم کے بہت سے اشعار اُسے یاد نہ ہوں اور حروف کے مخارج کو اچھی طرح ادا نہ کر سکے۔ اس طرح اُسے کافی لٹریچر پر عبور حاصل کرنا ضروری ہوتا تھا۔

بلکہ ہم نے تو گانے والیوں کے متعلق ایسی بہت سی روایات دیکھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گاتی

---

[1] اغانی صفحہ ۱۶۲ جلد ۸ — [2] اغانی صفحہ ۳۵/۷ و نیز جلد نہم
[3] اغانی صفحہ ۵۵ جلد ۹

تھیں تو اشعار اور راگ خود ان کی اختراع ہوا کرتے تھے۔

ابو ولامہ شاعر کے شعروں کا ترجمہ۔

یہ بنواسد کے ایک بوڑھے آدمی کا خط ہے جس میں وہ عباس کو اپنا سلام بھیجتا ہے یہ خط ان چند صحیفوں کے ساتھ بھیجا جا رہا ہے جو مصر کی باندیوں میں سے ایک لکھنے والی باندی نے لکھے ہیں جس نے لام اور الف (حروف نویسی) کی بڑی ہی مشق بہم پہنچائی ہے۔ سردی اور گرمی میں وہ عرصۂ دراز تک تختی اور دوفتی لے کر اپنے استاد کے پاس کتابت کا فن سیکھنے کے لئے جاتی رہی حتیٰ کہ اس کے پستان ابھر آئے اور بھر گئے اور اس کے متعلق یہ اندیشہ کیا جانے لگا کہ کہیں وہ کسی لغزش میں آ کر کسی برائی میں گرفتار نہ ہو جائے تو تین سال سے اسے پردہ میں بٹھا کر اس کی اس طرح حفاظت کی جاتی ہے کہ وہ کسی آدمی کو بھی نہیں دیکھ سکتی جیسا کہ تجارت پیشہ لوگ سیپی کے اندر موتی کی حفاظت کیا کرتے ہیں۔

عُریب مغنیہ، باندیوں کو اشعار رواں کرایا کرتی تھی تاکہ وہ انہیں عمدگی کے ساتھ گا سکیں[1]۔ امام مبرد کا بیان ہے کہ مجھ سے - - - - - - - امام جاحظ نے ابراہیم ابن السندی سے نقل کیا کہ میرے پاس "حمدونہ" کی باندی "ہاشمیہ" اپنی مالکہ کی ضرورتوں سے آجایا کرتی تھی۔ جب وہ آتی تھی تو مجھے اپنے حواس بجا کر کے سارے خطرات ذہن سے نکال کر ہمہ تن وہیں کو اس کی طرف متوجہ کر دینا پڑتا تھا کہ کہیں وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ جائے جسے میں سمجھ نہ سکوں کیونکہ لٹریچر پر اس کی بہت ہی گہری نظر تھی اور اس بات پر اسے بڑی ہی قدرت حاصل تھی کہ زبان وہ کچھ ادا کرے جو اس کے دل میں ہو —— اس قسم کی باتیں ریطہ بنت ابی العباس کی دونوں باندیوں خالصہ اور رعنبہ کے متعلق بھی نقل کی جاتی ہیں[2]۔

مسعودی کا بیان ہے کہ جب متوکل خلیفہ ہوا تو ابن طاہر نے اسے تحائف ہدایا بھیجے ان میں سو غلام اور باندیاں تھیں۔ ان ہدایا میں ایک باندی تھی جس کا نام "محبوبہ" تھا۔ یہ باندی طائف کے ایک آدمی کے پاس تھی جسے اس نے کافی عربی لٹریچر اور ثقافت کی بڑی گہری تعلیم دی تھی۔ علاوہ ازیں اس نے اسے مختلف علوم و فنون کی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کر دیا تھا۔ اسے ان تمام علوم کی بڑی اچھی بصیرت حاصل تھی جن کی بصیرت بڑے بڑے علماء ہی کی ہو سکتی ہے۔ متوکل اس باندی کی بڑی عزت کرتا تھا۔

لہٰذا باندیاں زیادہ تر ادب اور لٹریچر اور دیگر علوم و فنون اور خصوصیت کے ساتھ گانے کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ اور ان تعلیمات کی وجہ سے ان کی قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکیں گے کہ ایک باندی فروخت کرنے کے لئے پیش کی گئی تو اس کی قیمت تین سو دینار لگائی گئی۔ اس باندی کو ابراہیم بن مہدی نے گانے کی تعلیم دی اور اس کے بعد جب اسے فروخت کے لئے پیش کیا گیا تو اس کی قیمت تین ہزار دینار لگائی گئی[3]۔

عُریب مشہور مغنیہ، پانچ ہزار دینار میں فروخت ہوئی تھی[4]۔

دحمان نے ایک باندی دو سو دینار میں خریدی اور اسے تعلیم و تربیت کے بعد دس ہزار دینار میں فروخت کیا[5]۔ ہارون رشید

---

[1] نشوار المحاضرہ صفحہ ۱۳۲ جلد ۱ [2] الکامل للمبرد صفحہ ۲۷۹ جلد ۲ [3] مروج الذہب ص ۳۰۹ ج ۲

[4] اغانی ص ۱۰۹ ج ۱۳ [5] اغانی ص ۱۴۳ ج ۵

نے موصلی سے ایک باندی چھتیس ہزار دینار میں خریدی تھی کیونکہ ہارون رشید سمجھتا تھا کہ وہ باندی اس کے لائق اور اس کی طبیعت کے مناسب ہے[1] اس طرح کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ابراہیم موصلی کو جو ہارون رشید کے مغنی تھے ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ـــــ باندیوں کو تعلیم و تربیت دینے اور انہیں مہذب بنانے کا بہت زیادہ سلیقہ اور شوق تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے اس امر کی طرف توجہ کی۔ ان کے بیٹے کا بیان ہے کہ "لوگ خوبصورت باندیوں کو گانا نہیں سکھاتے تھے بلکہ زرد رو اور سیاہ فام باندیوں کو گانے کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ سب سے پہلے حسین و جمیل باندیوں کو جس نے گانے کی تعلیم دی وہ میرے والد تھے۔ انہوں نے باندیوں کی تعلیم و تربیت پر ہر ممکن سعی فرمائی اور ان کی قدر کو بڑھانے میں بڑا کام کیا۔" اس سلسلہ میں ابو عیینہ شاعر کے یہ اشعار قابل توجہ ہیں۔ ابو عیینہ کو ایک باندی سے عشق ہو گیا تھا، اس باندی کا نام "امان" تھا۔ اس کے مالک نے اس کی بڑی گراں بہا قیمت مانگی تھی۔

جب میں نے "امان" کے مالک کو دیکھا کہ وہ اس کی قیمت لگانے میں حدود سے متجاوز ہو گیا ہے تو میں نے کہا۔ خدا ابو اسحٰق موصلی کو ہم لوگوں کی طرف سے جزائے خیر نہ دے اور اس پر احسان نہ کرے۔ وہ شیطان کی طرف سے وحی لے کر رسول بن کر آیا اور اس نے باندیوں کا نرخ انہیں گانا سکھا کر گراں کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گانا محبت کی سکرات ہے جس سے دل اور کان دونوں یکساں طور پر گرفتار محبت ہو جاتے ہیں[2]

ابراہیم موصلی اور یزید حوراء نے باندیوں کو خریدنے اور انہیں گانا سکھانے کے لئے ایک کمپنی بنائی تھی اور نفع میں وہ دونوں شریک تھے[3]

ثقافت اور فنون پر باندیوں کے اثرات

ان باندیوں نے ایک نئی قسم کی تہذیب و ثقافت پھیلا دی تھی جو عباسیوں جیسی مذہبیت میں ناگزیر تھی۔ یہ امر تو ہر مذہبیت ہی میں ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ نئی قسم کی تہذیب و ثقافت فنون لطیفہ کا ترقی یافتہ فنی ذوق تھا۔ اس عہد میں حرکت علمیہ کے پہلو بہ پہلو ایک دوسری حرکت بھی چل رہی تھی جو کسی طرح پہلی حرکت سے فروتر یا کم نہیں تھی۔ یہ فنی حرکت تھی۔ اس میں گانا بجانا، نقاشی، صورت گری اور رقص و سرود شامل تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کا جمالیاتی ذوق بڑی شدت کے ساتھ بیدار ہو چکا تھا۔ ان کے شعراء ـــــ خصوصیت کے ساتھ مسلم بن ابو لبید اور ابو نواس وغیرہ ـــــ نے حسن و جمال کی تعریف، اس میں وارفتگی اور بغیر کسی تکان کے اس میں مشغولیت کے مضامین میں بڑے ہی تفنن سے کام لیا۔ ابو نواس کہتا ہے۔

حسن کے لئے اس کے رخساروں میں ایک عجیب بات ہے۔ ان کا پڑھنے والا اور مطالعہ کرنے والا کبھی اکتاتا نہیں۔

---

[1] اغانی صفحہ ۷ ج ۵
[2] اغانی صفحہ ۹ ج ۵
[3] اغانی صفحہ ۴۳ جلد ۳

جاحظ کا بیان ہے کہ جو کوئی مرغے اور مرغی کو پانی پیتا ہوا دیکھ لے وہ کتنا ہی پیاسا کیوں نہ ہو۔ مرغے اور مرغی کے پانی پینے کی بدذوقی کو دیکھ کر اس کی پیاس جاتی رہتی ہے۔ لیکن جو کوئی کبوتر کو پانی پیتا ہوا دیکھ لے وہ کتنا ہی سیراب ہو کر کیوں نہ آ رہا ہو۔ کبوتر کے پانی پینے کے حسن کو دیکھ کر اس کا جی بھی چاہنے لگتا ہے کہ وہ بھی پانی میں منہ ڈال دے[1]۔ اس سے ــــــ بلاشبہ ــــــ معلوم ہو سکتا ہے کہ ان دنوں لوگوں کا جمالیاتی شعور کس قدر شدید ہو گیا تھا۔ عتابی بزم مجلس کا جمال اسے شمار کرتا تھا کہ اس کی چھت بھی سرخ رنگ کی ہو اور فرش بھی سرخ رنگ کا ہو۔ بشار کہتا ہے۔

وہ دو عملی نسل کی ہے۔ اس میں سفیدی کے ساتھ سرخی ملی ہوئی ہے جس سے آنکھیں تروتازہ ہو جاتی ہیں اور حسن تو نام ہی سرخی کا ہے۔

جیسا کہ ان لوگوں میں جمال صورت کا شعور بیدار ہو گیا تھا اسی طرح جمال معنیٰ کا شعور بھی بیدار ہو چکا تھا۔ چنانچہ حسن روح اور حسن گفتگو کے متعلق بھی انہوں نے اس عہد میں بہت کچھ کہا۔ بشار یہ کہتا ہے کہ

وہ جب باتیں کرتی اور باتوں کا جواب دیتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ باغ کی کیاریاں ہیں جس میں پھول ہی پھول کھلے ہوئے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان کے نیچے ہاروت بیٹھا ہوا ہے جو اس کی ہر بات میں جادو پھونک دیتا ہے۔

اور کہتا ہے۔

بعض کنواری لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کی باتیں باغ کے پھولوں کی طرح ہوتی ہیں۔ وہ اپنے روشن چہرے اور سیدھے قد سے دلوں پر چھا جاتی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس جمالیاتی شعور کی بیداری اور اس کے ماتحت فنون لطیفہ کو پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ باندیاں ہی تھیں۔ لوگ اس عہد میں جس کی تاریخ ہم بیان کر رہے ہیں ان باندیوں کے محض جسمانی حسن کے پہلو ہی پر اکتفاء نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے فنی جمال کے پہلو پر بھی توجہ دیتے تھے تاکہ دونوں طرح کی خوبصورتیاں ان کے پاس جمع ہو جائیں۔ گانے اور ناچنے کی طرف ان کو میلان تھا نئے نئے طرح کے لباسوں کا انہیں شوق تھا۔ وغیر ذالک۔ انہوں نے باندیوں کو یہ فنون سکھانے شروع کئے۔ اور بہت جلد یہ فنی شعور مردوں سے باندیوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ بلند پایہ مغنیوں نے اپنی باندیوں کو اپنے راگ، سُر اور اپنے گانے کا انداز سکھانا شروع کیا۔ چنانچہ ابراہیم موصلی اپنی باندیوں کو اپنے فن کی تعلیم دیتے تھے حتیٰ کہ وہ ان کے فن میں کمال حاصل کر لیتی تھیں۔ عبداللہ ابن طاہر مکمل علمی انداز میں گانا سکھاتے تھے۔ وہ نئے نئے راگ بناتے اور باندیوں کو سکھاتے تھے۔ مغنی ان دنوں دو طرح کے ہوتے تھے۔ ایک تو پرانی جماعت تھی اور دوسری نئی جماعت۔ اسی طرح باندیوں کے بھی دو گروہ ہو گئے تھے کیونکہ جن سے انہوں نے تعلیم پائی تھی خود ان کے دو گروہ تھے۔ کتاب الاغانی گانے والی باندیوں کے حالات زندگی سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً عُریب، مقیم، بذل، ذات الخال فریدہ وغیرہ۔ صاحب اغانی نے لمبی لمبی فصلوں میں ان باندیوں کے نوادرات اور ان میں سے ہر ایک کے خصوصی امتیازات اور برتری کی انواع بیان کی ہیں۔

اب ہم ان فنون کی کچھ انواع بیان کریں گے جو ان باندیوں نے پھیلائی تھیں۔

---

[1] الحیوان صفحہ ۳۳ جلد ۵

ان میں سے سب سے پہلی چیز گانا تھا۔ عمدہ گانوں سے ان باندیوں نے پورے عراق کو بھر کر رکھ دیا تھا۔ لہو ولعب اور عشق و محبت تو اس کے اثرات تھے ہی۔ یہ باندیاں دو طرح کی تھیں۔ ایک تو خاص لوگوں کی باندیاں ہوتی تھیں۔ چنانچہ خلیفہ کی اپنی باندیاں تھیں جو اسے گانا سناتی تھیں اور امراء اور مالدار لوگوں کی باندیاں بھی اسی طرح کی باندیاں ہوتی تھیں پھر یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو باندیوں کے تحفے دیتے تھے تاکہ ان کے ذوق تجدد کی تسکین ہو سکے کیونکہ ایک ہی طرح کی آواز سنتے سنتے وہ اکتا جاتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس میں کچھ تبدیلی ہو سکے۔

ایک دوسری قسم عام گانے والیوں کی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کوئی نخاس جوان کا مالک ہوتا کسی مقام پر انہیں گانے کے لئے پیش کرتا جہاں ان کا گانا سننے کے لئے نوجوان جمع ہو جاتے اور ان پر خرچ کرتے۔ اس کا ایک نمونہ وہ حکایت ہے جو صاحب اغانی نے "ابن رامین" کے متعلق نقل کی ہے۔ ابن رامین کا کوفہ میں اپنا مکان تھا۔ اس کے پاس کئی گانے والی باندیاں تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت "سلامت زرقاء" کی تھی۔ ابن رامین کوفہ میں سب سے بڑا گانے والی باندیوں کا کاروبار کرنے والا تھا۔ اس کے مکان میں نوجوان گانا سننے اور شراب پینے کے لئے جمع ہو جایا کرتے تھے۔ شعراء اس کے اور اس کی گانے والی باندیوں کے بارہ میں اشعار کہتے تھے۔ اس کے مکان پر جن لوگوں کی آمدورفت رہتی تھی ان میں روح بن حاتم مہلبی، محمد بن الاشعث، معن ابن زائدہ اور ابن المقفع جیسے جلیل القدر لوگ بھی شامل تھے یہ لوگ گانا سنتے اور دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ غزل کے اشعار سناتے تھے۔ جب ابن رامین اپنی ساری باندیوں کو لے کر حج کے ارادہ سے روانہ ہوا تو شعراء نے اس کی مجلس کی جدائی اور ان لوگوں کی کثرت کے بیان میں جو اس کے گھر پہ آیا کرتے تھے اشعار کہے۔ ان میں سے کسی ایک کے اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔

> اے ابن رامین تجھے کچھ معلوم بھی ہے کہ محبت کرنے والے مسکینوں کا کیا حال ہے؟ تو انہیں مُردہ کر کے چھوڑ گیا مگر وہ ختم بھی تو نہ ہو گئے۔ انہیں تیری طرف سے وہ کڑوی چیزیں گھونٹ گھونٹ کر کے پینی پڑ رہی ہیں تو ایک قافلہ کے ساتھ سواری پر بیٹھ کر چل دیا وہ قافلہ تہامہ اور یمن والوں کا تھا۔ اے اونٹوں کو ہنکانے والے تو نے انہیں خوف زدہ کر دیا۔ تیرا ناس ہو محبت کرنے والوں کو خوف زدہ کر دیا۔ تو نے ایک ایسی جماعت کو پراگندہ کر دیا جس جیسی جماعت روم اور چین کے محلوں میں بھی نہیں مل سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی باندیوں نے معاشرہ کے اندر رندی و آزاد منشی علانیہ اظہار عشق و محبت کو پھیلا کر بڑے ہی بُرے اثرات مرتب کیئے۔ جس نے رسالہ "ایقان" ——— جو جاحظ کی طرف منسوب ہے ——— یا کتاب "الموشّٰی" میں گانے والیوں کی مذمت میں " و شّاء" کا بیان پڑھا ہے وہ پتہ لگا سکتا ہے کہ ان باندیوں کا معاشرہ پر کتنا گہرا اثر تھا جس کا سایہ اس عہد کے رند مشرب اور آزاد خیال شعراء کے کلام پر بہت کافی پڑا تھا۔ اور رند مشرب اور آزاد خیال شعراء ہی کی اس زمانہ میں کثرت تھی[۱]۔ جاحظ نے ان نوجوان عورتوں کے خراب ہو جانے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا ہے۔" ایک گانے والی عورت فتنہ سے کس طرح بچ سکتی یا کس طرح عفیفت اور پاک دامن رہ سکتی ہے؟ خواہشات نفسانی ہی اس کا ذریعہ معاش ہوتی ہیں اور اسے ایسی زبانیں اور ایسے اخلاق سیکھنے پڑتے ہیں جن سے وہ دوسروں کو

---

[۱] الموشّی صفحہ ۹۵ وما بعد۔

خوش رکھ سکے۔ وہ پیدائش سے لے کر اپنے مرنے کے وقت تک ان حالات میں زندگی گزارتی ہے جو لہو ولعب سے تعلق رکھتے ہیں اور خدا کو یاد کرنے سے مانع ہوتے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں میں انہیں زندگی گزارنی پڑتی ہے جو رند مشرب اور اوباش قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن سے کبھی کوئی ڈھنگ کی بات سننے میں نہیں آتی۔ نہ ان سے ثقاہت، دینداری، مروت وغیرہ کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ان میں سے جو گانے میں ماہر ہوتی ہیں وہ چار چار ہزار زنال اور سُر بلکہ ان سے بھی زیادہ نقل کرتی ہیں۔ ہر زنال اور سُر دو شعر یا شعروں میں ادا ہوتا ہے۔ یہ اشعار ان اشعار سے الگ ہوتے ہیں جو ویسے ہی ان کو یاد کرنے پڑتے ہیں۔ اگر ان اشعار کو جمع کیا جائے تو اس قسم کے کم از کم دس ہزار اشعار نکلیں گے جن میں سے کسی ایک میں بھی خدا کا نام نہیں ہوتا۔ خدا سے غافل کرنے والے مضامین ہی ہوتے ہیں ان میں سے کسی شعر میں خدا کے عذاب سے ڈرانے یا ثواب کی رغبت کے مضامین نہیں ہونگے۔ سارے اشعار میں عشق، محبت، اشتیاق وغیرہ کا ذکر ہوگا۔ پھر ایک گانے والی عورت کو اپنے فن کی خاطر ہمیشہ اس قسم کی چیزیں پڑھنی پڑتی ہیں اور ہمہ تن ان پر متوجہ رہنا پڑتا ہے اور رند مشرب لوگوں سے اسے یہ چیزیں سیکھنی پڑتی ہیں۔ انہیں وہ چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ اگر وہ ان چیزوں کو چھوڑتی ہے تو اس کی مقبولیت میں کمی آتی ہے اور وہ ایک مقام پر کھڑی رہ جاتی ہے۔ جو آدمی ایک مقام پر کھڑا ہو کر رہ جائے ظاہر ہے کہ وہ نقصان کی طرف جا رہا ہے۔[1]

اس کے علاوہ باندیوں نے خوش ذوقی کی بھی بہت سی چیزیں پھیلائیں جن میں لوگوں نے ان کی پیروی کی اور ان کے نقوش قدم پر چلے مثلاً پھولوں سے محبت اور ان کا عشق۔ اغانی کا بیان ہے کہ علی ابن ہشام کی باندی کو بنفشہ کے پھول بہت ہی پسند تھے۔ اس کے پاس طرح طرح کے پھول اور خوشبوئیں رہا کرتی تھیں۔ چونکہ اسے یہ چیزیں بہت ہی پسند تھیں اس لئے بہت کم اس کی آستینیں ان چیزوں سے خالی رہتی تھی۔ اسے جب بھی دیکھو ایسی نظر آتی تھی جیسے اسے ابھی ابھی باغ کی کسی شاخ سے توڑ کر لایا گیا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کو اب پھولوں سے نئے نئے مضامین سوجھنے لگے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

> اس نے اسے تسلّی کی خاطر بنفشہ کا پھول تحفہ میں بھیجا جس سے اس طرف اشارہ تھا کہ وہ اس پر اپنی جان قربان کرتی ہے۔ وہ عشق و محبت اور اس کی مشقت و تکلیف کے بعد راحت محسوس کرنے لگا۔ اور اسے نیک گمان کی وجہ سے یہ امید بندھ گئی کہ وہ اسے اپنا قرب بخش دے گی۔

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے کہ

> اس نے اسے آس کے پھول تحفہ میں بھیجے تو وہ خوش ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد جب اس نے گلاب کا پھول تحفہ میں بھیجا تو وہ فریاد کرنے لگا۔ وجہ یہ کہ آس تو ہمیشہ باقی رہتا ہے لیکن گلاب کے پھول کچھ عرصہ کے لئے بند ہو جاتے ہیں۔

ایک دوسری قسم کی عجیب چیز لوگوں میں پھیل گئی تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ عمدہ قسم کے اشعار اور ظرافت آمیز جملے زردوزی کے کام سے قمیصوں، چادروں، آستینوں وغیرہ پر لکھوا لیا کرتے تھے۔ ماوردی کا بیان ہے کہ میں نے ایک باندی کو دیکھا ہم اس وقت محمد بن عمرو بن سعدہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے وہ باندی ایک قمیص پہنے ہوئے تھی جس کے دامن پر یہ شعر لکھا ہوا تھا

---

[1] رسالۃ القیان صفحہ ۲۷

میں محبت کے ساتھ تیرے پاس سے جا رہی ہوں۔ وہ محبت جسے مقام کی دوری اور زمانہ کے تغیرات تبدیل نہیں کر سکتے۔

چادر پر زردوزی کے ساتھ یہ شعر لکھا ہوا تھا جس کا ترجمہ یہ ہے۔

دنیا میں سب سے کم خوشی اسے نصیب ہوتی ہے جس کا محبوب اس سے دور چلا گیا ہو۔

مادرودی ہی کا بیان ہے کہ میں نے کسی ہاشمی کی باندی کو دیکھا۔ اس باندی کا نام "حبیب" تھا وہ ایک زردوزی کے کام کی قمیص پہنے ہوئے تھی اور اس کے دامن پر دو شعر لکھے ہوئے تھے۔

میں اس سے برابر عشق کرتی رہوں گی خواہ وہ بُرا سلوک کرے یا اچھا سلوک کرے اور میں اپنے دل کے خلاف وہی فیصلے کرتی رہوں گی جو وہ فیصلے کریگا۔ کب تک مجھے رضامندی کی روح حاصل نہیں ہوگی اور کب تک تیری ناراضگی کے دن نہیں گزرینگے۔

پیٹیوں پر، موباف باندھنے کی جگہوں پر، سینہ بند پر، زناروں پر، رومالوں پر، گدّوں اور بچھونوں پر، تختوں پر، سر کے لباسوں پر، جوتوں پر، موزوں پر، حتٰی کہ مہندی کے ساتھ پیروں اور ہتھیلیوں پر اسی قسم کی چیزیں لکھی ہوئی ہوتی تھیں[1]۔

لوگوں میں خوش مذاقی کا یہ شعور پیدا کرنے اور ان کی حدود کا التزام کرنے میں باندیاں بہت کامیاب رہیں۔ حتٰی کہ خوش مذاق لوگوں کا لباس، نظر، کھانے پینے غرضکہ ہر چیز میں ایک خاص انداز قرار پا گیا۔ "وشّاء" نے اس خاص انداز کو کہ خوش مذاق لوگوں کے لئے اسے قانونی صورت دیکر اپنی کتاب "الموشّیٰ" میں مدوّن کر دیا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ان تمام باتوں کا سہرا صرف باندیوں کے سر ہی تھا۔ یقیناً ان کے مالکوں کا بھی اس میں حصّہ تھا جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ابراہیم موصلی اور ان جیسے دیگر مغنیوں نے ہی تو ان باندیوں کو گانا سکھایا تھا۔ اور انہیں ان کے راگ اور شعر یاد کرائے تھے اور اونچے طبقہ کے لوگوں نے ہی باندیوں کے دلوں میں خوش مذاقی کی یہ تمام چیزیں ڈالی تھیں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ معاشرہ کے مختلف طبقات میں ان باتوں کو مقبول بنانے اور فنونِ جمیلہ کو ان میں پھیلانے کے اندر صرف باندیوں ہی کا حصّہ تھا۔ کیونکہ انھیں ہی ان باتوں میں زیادہ انہماک تھا اور لوگ انہی کی پیروی کرتے تھے کیونکہ لوگوں کو طبعاً ان باتوں کی طرف میلان ہوتا تھا جنہیں یہ باندیاں پسند کرتی تھیں۔

ان باندیوں کا ایک اور بھی احسان تھا۔ یہ باندیاں ـــ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں ـــ مختلف قوموں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں ہندی بھی تھیں، ترکی بھی اور رومی بھی وغیرہ ذٰلک۔ ہر قسم کی باندیاں لائی جاتی تھیں۔ ان کی اپنی عادتیں پختگی پا چکی ہوتی تھیں۔ یا تقریباً پختہ ہو چکی تھیں۔ رومی باندیاں اپنے ساتھ گانے اور دیگر انواع میں اپنی قوم کی عادات کو لے کر آتی تھیں۔ یہی حال باقی قوموں کی باندیوں کا بھی تھا۔ اس کے بعد یہ مملکت اسلامی میں آتی تھیں اور اپنی عادتوں کو یہاں آ کر پھیلاتی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد دوسری قوموں کی باندیوں کی عادات پر بھی ان کی نظر پڑتی تھی اور بالآخر قانونِ انتخاب کے مطابق جو بات سب سے زیادہ بہتر ہوتی وہ چل نکلتی اور اس کا رواج پڑ جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ ان کا گانا بجانا بھی منتخب ہوا کرتا تھا۔ یہی وہ بات ہے جس سے اس شدید نزاع کی توجیہہ ہو جاتی ہے جو اغانی نے نقل کیا ہے کہ مغنیوں کی ایک جماعت قدیم گانوں کے ساتھ وابستگی رکھتی تھی اور دوسری جماعت جدید قسم کے گانوں سے مانوس تھی۔ ظاہر ہے کہ قدیم قسم کے گانے تو وہی تھے جو دولت امویہ کے عہد سے معبد اور اس جیسے دوسرے مغنیوں سے مانوس چلے آ رہے تھے۔ اور جدید قسم کے گانے وہ تھے جو فارسی اور رومی نغمات سے ترکیب دے کر بعد میں پیدا کئے گئے تھے یعنیہ یہی حال دیگر

---

[1] اس قسم کی بہت سی چیزیں آپ کو کتاب الموشّیٰ میں ملیں گی۔

فنون کا بھی تھا۔

باقی فنون جمیلہ کی طرح ایک اور فن بھی تھا جس میں باندیوں کے اثرات بڑے نمایاں تھے، یہ دوسرا فن عربی لٹریچر تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہر قوم میں اور ہر زمانہ میں لٹریچر پر عورت کا دو جہت سے بڑا احسان ہوتا ہے (پہلی جہت) تو یہ ہے کہ عورت ہی مردوں کے دلوں میں ان شدید جذبات کو بھڑکاتی ہے جو ان کے سینوں میں طوفان برپا کر دیتے۔ اس کے بعد وہ ان کی زبانوں سے نفیس شعر اور پُر معنی لٹریچر کو ادا کراتی ہے۔ (دوسری جہت) فنی اور ادبی شہ پاروں کو جنم دینے میں مردوں کے ساتھ عورت کی شرکت ہے، خصوصیت کے ساتھ ان موقعوں پر جو عورت کے شعور کو زیادہ متاثر کر سکیں۔ اور عورتوں کو اس پر زیادہ قدرت ہوتی ہے۔

عباسی دور حکومت میں بھی یہی حالت تھی۔ ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ دونوں جہتوں کے اعتبار سے باندیوں کا پلڑا

آزاد عورتوں اور باندیوں میں مقابلہ

آزاد عورتوں کے مقابلہ میں کہیں بھاری تھا۔ یعنی ادبی شہ پارے پیدا کرنے کے اعتبار سے بھی اور شعراء کو معانی و مضامین سمجھانے کے اعتبار سے بھی۔ اس کی وجہ غالباً اس زمانہ کا نظام اجتماعی تھا۔ لوگ ——— جیسا کہ ہم جا خط سے پہلے نقل کر چکے ہیں ——— آزاد عورتوں پر بہ نسبت باندیوں کے زیادہ غیرت محسوس کرتے تھے ——— آزاد عورتوں کو پردہ میں بٹھاتے تھے، اور پردہ میں بڑی شدت برتتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تو وہ پیغام دینے کے لئے کسی عورت ہی کو بھیجتا تھا جو لڑکی کو دیکھ کر آتی اور مرد سے آکر اس کے عیوب اور محاسن بیان کرتی تھی۔ خود مرد اگر چاہتا تو لڑکی کو نہیں دیکھ سکتا تھا وہ شادی ہو جانے کے بعد ہی اسے دیکھ سکتا تھا لیکن باندیوں کی یہ صورت نہیں تھی۔ اس کی وجہ سے لوگ اتنی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ پھر یہ بھی کہ باندیاں ایک بڑی حد تک بے پردہ ہوتی تھیں کیونکہ وہ تو ہر وقت خریدی اور فروخت کی جا سکتی تھیں۔ پھر یہ بھی کہ باندیاں تو آدمی کی تمام ضرورتوں کو پورا کریں اور مالک کی ضروریات کے لئے ہر وقت باہر نکلنے پر مجبور تھیں۔ جب کوئی عام آدمی گانے والی باندیاں رکھنے والوں کے مکانات پر جا کر گانا سننا چاہتا یا گانے والی باندیوں کے ساتھ چہل اور ہنسی مذاق کرنا چاہتا تھا تو یہی باندیاں اس کے ارمان خاطر کی تسکین کرتی تھیں۔ یہ باندیاں ہی ——— بے پردہ ہونے کی وجہ سے وہ عورتیں تھیں جن پر لوگوں کی نگاہیں پڑتی تھیں۔ کیونکہ آزاد عورتوں کو تو ان کے قریبی عزیزوں کے سوا کوئی غیر آدمی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا یہ چیز بالکل طبعی تھی کہ ادیب اور شعراء اپنے ادب اور شعر کی غذا باندیوں سے ——— بہ نسبت آزاد عورتوں کے ——— کہیں زیادہ حاصل کرتے تھے۔ دوسری طرف یہ بات بھی تھی کہ آزاد عورتوں کو تعلیم دینے کے مقابلہ میں ——— جیسا کہ ظاہر ہے ——— باندیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دیتے تھے۔ اس کی وجہ خالص تجارتی نقطۂ نظر تھا۔ کیونکہ آپ دیکھ چکے ہیں بازار میں باندی کے جسم سے زیادہ اس کے علم اور ادب کی قیمت لگائی جاتی تھی۔ اگر ایک جاہل باندی کی قیمت دو سو دینار ہوتی تھی تو مغنیہ اور ادیبہ ہونے کے بعد اس کی قیمت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا تھا۔ اور بہر حال ہر زمانہ میں مال و دولت ہی حرکات اجتماعیہ کا مرکز و محور رہا ہے۔ آزاد عورتوں کی تعلیم و تربیت پر ایک چھوٹے سے طبقہ کے سوا عموماً کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ یہ طبقہ اشراف اور امراء کا تھا اور یہ چند گنتی کے لوگ ہوتے تھے۔ دوسری وجہ بھی تھی کہ لوگ دیکھتے تھے کہ باندیاں

تو لوگوں کا سامان تفریح ہیں۔ لہٰذا جو لوگ اس سامان تفریح کو مہیا کرنے والے تھے وہ اس کا بھی خیال رکھتے تھے کہ لوگوں کی خواہشات کے مطابق وہ لحظہ بلحظہ اسے ترقی دیں کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ باندی اگر مغنیہ، ادیبہ اور موسیقار ہوتی تھی تو لوگوں کے دلوں پر زیادہ اثر انداز ہوتی تھی اور لوگوں کا اس کی طرف میلان بہت زیادہ ہوتا تھا۔ لہٰذا لوگوں کی خواہشات کی تسکین کا سامان مہیا کرنے میں وہ کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔

ہاں! بہت سی آزاد عورتیں بھی ہمیں ایسی ملتی ہیں جو بعض علوم میں مشغول رہیں۔ لیکن ان کی اس مشغولیت کا زیادہ تر باعث دینی پہلو ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ تاریخ میں ہمیں کئی محدث عورتیں اور متصوف عورتیں مل جاتی ہیں۔ لیکن یہاں یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہمارا موضوع تو یہاں فنون جمیلہ میں عورتوں کا مشغول ہونا ہے۔ اور باندیاں ——— بلاشبہ ——— اس ضمن میں بہت زیادہ ہیں اور ان کے اثرات بھی زیادہ نمایاں ہیں۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ ——— اگر انشائی جہت سے دیکھا جائے ——— تو ہمیں بے شمار ایسی باندیاں مل جائیں گی جو بلند پایہ ادیبہ ہوں گی اور مختلف علوم و فنون کی ماہر ہوں گی ایسی ماہر کہ آزاد عورتیں ان کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ "عُریب" کے بارہ میں اغانی کا بیان ہے کہ وہ نہایت خوش گلو مغنیہ، بلند پایہ شاعرہ اور خوش خط تھی۔ اس کا انداز گفتگو نہایت ہی حسین، حسن و جمال اور خوش مذاقی میں نہایت اعلیٰ مرتبہ پر فائز، خوبصورت، بہترین سازندہ، نغموں اور راگوں کو بہترین طور پر سمجھنے والی اور ادا کرنے والی اور شعر و ادب کی بہترین طور پر بیان کرنے والی تھی[1]۔ نیز "مقیم" کے بارہ میں اغانی کا بیان ہے کہ ——— زرد رو عورت تھی۔ بصرہ میں اس کی پیدائش کسی باندی کے بطن سے ہوئی تھی۔ بصرہ ہی میں نشو و نما پائی اور وہیں لٹریچر اور گانے کی تعلیم حاصل کی۔ اسحاق موصلی سے اس فن کو سیکھا اور اس سے پہلے اسحاق موصلی کے والد سے بھی استفادہ کیا۔ اس کا چہرہ نہایت ہی حسین تھا۔ موسیقی اور ادب پر بڑا عبور تھا۔ شعر کہتی تھی جو اگرچہ بہت عمدہ تو نہیں ہوتے تھے لیکن اس جیسی لڑکی کے لئے بہرحال قابل فخر تھے[2]۔ نیز "دنانیر" کے بارہ میں اغانی ہی کا بیان ہے کہ یحییٰ بن خالد برمکی کی باندی تھی۔ نہایت ہی حسین و جمیل چہرہ۔ نہایت خوش مذاق اور کامل ترین عورت تھی۔ لٹریچر پر اسے کافی عبور تھا۔ اسے بے شمار گانے اور بے شمار اشعار یاد تھے۔

دوسری طرف ——— یہ باندیاں شعراء کو شعر کے نت نئے مضامین سمجھاتی تھیں اس کا سبب ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ بشار، ایک باندی پر عاشق تھا جس کا نام "فاطمہ" تھا۔ اس نے اسے گاتے ہوئے سنا اور اس پر عاشق ہو گیا۔ اور اس کے بارہ میں بہت سے اشعار کہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے وہ ایک سیاہ فام باندی کے بارہ میں بھی اشعار کہتا رہا ہے۔ دعبل خزاعی، مسلم بن الولید۔ صریع الغوانی کی زندگیاں ان واقعات سے بھری پڑی ہیں جو انہیں باندیوں کے ساتھ پیش آئے ان سب نے ان کے بارہ میں اشعار بھی کہے۔ ابو نواس شاعر ایک باندی پر عاشق تھا جس کا نام "جنان" تھا۔ یہ عبدالوہاب بن عبدالمجید ثقفی کے خاندان کی باندی تھی۔ یہ بھی نہایت حسین باندی تھی۔ اسے بھی لٹریچر پر کافی عبور حاصل تھا۔ واقعات عرب اور اشعار وغیرہ کی روایت کرنے میں

---

[1] اغانی صفحہ ۱۷۵ جلد ۱۸ [2] اغانی صفحہ ۳۱ جلد ۷

اس کا بڑا حصہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ابو نواس کو اس کے سوا کسی عورت سے سچا عشق نہیں ہوا۔ ابو نواس نے اس کے بارہ میں اپنے بہترین اشعار کہے ہیں ——— عباس ابن احنف کو بھی "فوز" نامی باندی سے عشق تھا۔ یہ محمد بن منصور کی باندی تھی۔ عباس نے اس کے بارہ میں اپنے بہترین اشعار کہے ہیں ———

یہ ہم نے چند مثالیں پیش کی ہیں۔ ورنہ لٹریری کتابیں اس قسم کے اشعار اور واقعات سے بھری پڑی ہیں جو نوجوان طبقہ کے لوگوں اشعراء اور ادباء کو ان باندیوں کے ساتھ اس زمانہ میں پیش آتے رہے۔

ادیبوں اور شاعروں کو اس حالتِ اجتماعیہ پر بڑا ہی رشک آتا تھا جس کے نتیجہ میں اس قدر عمدہ اشعار اور ادبی شہ پارے عالم وجود میں آسکے تو دوسری طرف علمائے دین اور علمائے اخلاق کو رونا آتا تھا کہ کس قدر ادبی عریانی اور رندی و اوباشی کو عروج حاصل ہو رہا تھا۔ اول الذکر حضرات لوگوں کو برانگیختہ کرتے تھے کہ اس حیاتِ نو سے استفادہ کریں اور اس کے ثمرات سے متمتع ہوں تو آخر الذکر حضرات لوگوں کے فسق و فجور کے مرثیے پڑھتے تھے پھر ان سب چیزوں سے بھاگ کر زاہدانہ زندگی اور لذائذ دنیوی سے فرار کے دامن میں پناہ لیتے تھے۔ ان امور کو ہم آئندہ فصل میں بیان کر رہے ہیں۔

طاہرہ کے نام خطوط

پرویز صاحب کے خطوط کا سلسلہ ہماری تعلیم یافتہ نئی نسل میں بڑا مقبول ہوا ہے اور ان کے قلب و دماغ میں جو صحیح انقلاب آیا ہے اس کا بیشتر انہی خطوط کا رہینِ منت ہے۔ سلیم کے نام خطوط (تین جلدیں ہیں) نوجوان طلباء کے نام ہیں اور طاہرہ کے نام، طالبات کے لئے جس میں بالخصوص عورتوں سے متعلق مباحث کو قرآن مجید اور علوم حاضرہ کی روشنی میں سلجھایا گیا ہے۔ یہ سلسلہ خواتین کے حلقہ میں بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور انہوں نے اسے بڑا مفید پایا ہے ——— قیمت ۱۰/- روپے علاوہ محصول ڈاک ——— ملنے کا پتہ:-

(۱) **مکتبہ دین و دانش، چوک اردو بازار لاہور**

(۲) **ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲، لاہور**

باسمہٖ تعالیٰ

لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ..... (۲۰/۶۸)

خوف

(قاطعِ شرفِ انسانیت)

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خوف و حُزن

(قاطعِ رگِ حیات)

علّامہ اقبال ؒ نے خوف و حزن کو "اُمّ الخبائث" اور قاطعِ حیات و توحید" قرار دیا ہے۔ فرمایا کہ ؎

هر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست — اصلِ او بیم است اگر بینی درست
لابہ و مکاری و کین و دروغ — ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ
پردۂ زُور و ریا، پیراہنش!
فتنہ را آغوشِ مادر دامنش (رموزِ بیخودی ص۱۱۱)

تمہارے قلب میں جو شر بھی پوشیدہ ہے، اگر غور سے دیکھو تو صاف نظر آجائے گا کہ اس کی اصل، خوف ہے۔ چاپلوسی، مکاری، کینہ، جھوٹ۔ یہ تمام خباثتیں خوف سے پرورش پاتی ہیں۔ منافقت اور فریب اس کے پردہ پوش ہوتے ہیں، اور ہر قسم کا فتنہ اس کے دامن میں یوں پرورش پاتا ہے جس طرح طفلِ نوزائیدہ آغوشِ مادر میں۔

اسی حقیقت کو وہ (نثر میں) ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

اسلام، نظامِ فطرت میں کرب و اذیت، گناہ اور کشمکش کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ انسان کے اخلاقی ارتقاء کے راستے میں یہ موانعات حائل نہیں۔ یہ درحقیقت خوف ہے جس کا یہ شکار ہوتا ہے۔ انسان اپنے سلسلہ ارتقاء کی بلند ترین سطح پر اس وقت پہنچتا ہے جب وہ خوف اور حزن سے یکسر آزاد ہو جائے۔۔۔۔۔۔ اسلام کا اخلاقی نصب العین یہ ہے کہ وہ انسان کو خوف و حزن سے آزاد کر کے اسے اس کی ذات کی ممکنات اور مضمر قوتوں کا احساس دلائے اور اس کے شعور میں اس حقیقت کو بیدار کر دے کہ اس کی ذات لامتناہی قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ (آگے چل کر اقبال ؒ کہتا ہے) اسے پھر سمجھ لیجئے کہ دنیا میں ہر برائی (VICE) کی جڑ خوف ہے۔

(THOUGHTS AND REFLECTIONS OF IQBAL PP. 34-37)

وہ کہتے ہیں کہ آپ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ آپ کو نظر آجائے گا کہ ہر دور میں، مستبد اور جابر قوتوں نے زیر دستوں پر اس قدر خوف مسلط کر رکھا تھا کہ ان میں جوہرِ انسانیت کی رمق تک باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ ظہورِ اسلام کے وقت حالت یہ ہو چکی تھی کہ ؎

بود انسان در جہاں انساں پرست　　ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش　　بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر　　بہر یک نخچیر، صد نخچیر گیر
صاحبِ اورنگ و ہم پیرِ کنشت　　باجے برکشتِ خرابِ او نوشت
در کلیسا اسقفِ رضواں فروش　　بہر ایں صید زبوں دامے بدوش
برہمن گل از خیابانش ببرد　　خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ　　(ایضاً ص ۱۱۹)

انسانوں کا ایک گروہ دوسرے انسانوں کی پرستش کرتے، اس درجہ پامال اور خستہ حال ہو چکا تھا کہ اس کی اپنی ہستی ہی باقی نہیں رہی تھی۔ ایک طرف ملوکیت کے استبداد نے اس کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑ رکھے تھے۔ دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کے ہامان اور نظامِ سرمایہ داری کے قارون دو گدھوں کی طرح اس کے جسدِ بے جان کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے ——— ایک شکار اور سینکڑوں شکاری ——— صاحبِ تاج و تخت (بادشاہ) اور مذہبی پیشوائیت کے استحصال کا یہ عالم تھا کہ اس کی کھیتی، خواہ وہ برباد اور ویران ہو کیوں نہ چکی ہو، وہ اپنا ٹیکس وصول کر کے رہیں گے۔ پادری اس کی محنت کے پسینے کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر، جنت کا پروانہ اس کے ہاتھ میں تھما دیتا تھا۔ برہمن اس کی پھلواری کا آخری پھول تک نوچ کر لے جاتا تھا۔ اور آتش کدوں کے مغ اس کے کھلیان کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتے تھے۔

غرضیکہ صدیوں کی غلامی اور محکومی سے اس کی فطرت پست ترین درجہ پر پہنچ چکی تھی، اور اس خوف و ہراس سے نغمۂ حیات اس کی رگوں میں خون بن کر جم چکا تھا۔

صدیوں کے خوف و ہراس نے اس کی یہ حالت کر رکھی تھی۔

قرآنِ کریم نے تاریخِ انسانیت کے جن گوشوں کو اپنے دامن میں لپیٹ رکھا ہے اس سے بھی اس حقیقت کی پردہ کشائی مقصود ہے کہ جابر و قاہر، مستبد اور ظالم اربابِ قوت و اقتدار، جب زیر دست، محکوم و مقہور انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے تو نوعِ انسان کا غمخوار، ضعیفوں اور ناداروں کا بہی خواہ،

پیغام برداران خداوندی

مظلوموں اور محکوموں کا یاور، ایک انسان، خدا کا یہ پیغام ان مستبد اربابِ اقتدار تک پہنچاتا کہ تمہیں اپنے ہی جیسے انسانوں پر حکومت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ تم ان کی محنت کی کمائی کے مالک نہیں بن سکتے۔ تم ان پر خوف و ہراس طاری کر کے، ان کی جرأتوں کو پامال، ان کے حوصلوں کو پست اور ان کی عزتِ نفس کو ضعف کا سد

کی طرح اپنی حرص و آز کی منڈیوں میں فروخت کر دیتے ہو۔ تمہیں اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ آزادی ہر انسان کا فطری حق ہے۔ تم انہیں اس سے محروم نہیں کر سکتے۔ حریت، جوہرِ انسانیت ہے۔ تم اسے سلب نہیں کر سکتے۔

وہ (خدا کے رسولؑ) خدا کا یہ پیغام ان اربابِ جور و استبداد تک، دلائل و براہین کی رُو سے پیش کرتے، لیکن یہ اس کا جواب اینٹ اور پتھر سے دیتے اور ہر وہ حربہ استعمال کرتے جس سے یہ پیغامبر خائف ہو جائیں اور عوام ڈر کے مارے، ان کا ساتھ نہ دیں۔ تمام انبیاءؑ سابقہ اور اقوامِ گذشتہ کی داستانوں کا یہی ملخص اور یہی ماحصل ہے۔ قرآن کریم اس سلسلۂ دعوت کا آغاز حضرت نوحؑ سے کرتا ہے۔ وہ ان اکابرین تک خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں، تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ: لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (۲۶/۱۱۶) "اے نوحؑ! اسے اچھی طرح سن رکھو۔ تمہاری اس قسم کی باتوں سے معاشرہ میں فساد برپا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ اگر تم اپنی دعوت سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے" ——— وہی، ان پر خوف طاری کرنے اور عوام کو ہراساں کرنے کا حربہ!

قومِ نوحؑ کے بعد ہمارے سامنے قومِ عادؑ آتی ہے جس کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی وہی پیغامِ خداوندی ان تک پہنچایا، اور (اسی طرح) علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رُو سے پہنچایا۔ انہوں نے اس کے جواب میں کس کس قسم کی سازشیں کیں، انہیں قرآن نے دو لفظوں میں سمٹا دیا ہے۔ حضرت ہودؑ نے ان اکابرین سے کہا کہ: فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ (۱۱/۵۵) تم میرے خلاف جس قدر سکیمیں (خفیہ سازشیں) تیار کرتے رہتے ہو، ان کے مطابق تم نے جو کچھ کرنا ہے، کر گزرو، اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ میں سب کچھ برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ خفیہ سازشوں کا اوّلیں مقصد فریقِ مقابل کے دل میں خوف و ہراس پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ ڈر کر اپنی دعوت کو ترک کر دے، تو فبہا ورنہ اگلا قدم اٹھایا جائے۔

قومِ عادؑ کے بعد ہمارے سامنے قومِ ثمودؑ آتی ہے جس کی طرف حضرت صالحؑ تشریف فرما ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی ان سے کہا کہ: وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۲۶/۱۵۲) "ملک میں فساد برپا نہ کرتے پھرو" ——— اور اس کے بعد نہایت نرمی اور شفقت سے انہیں، بدلائل و براہین سمجھاتے رہے کہ ان کے ظلم و استبداد کا نتیجہ خود ان کی تباہی ہوگا۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ان مفسدین کے نو[۹] سرغنے تھے جو ملک میں تباہی مچاتے رہتے تھے۔[۱] انہوں نے حضرت صالحؑ کی دعوت کا جو جواب دیا اسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا

---

[۱] چوٹی کے اربابِ اقتدار کی تعداد تھوڑی سی ہوتی ہے لیکن وہی تمام فسادات کی جڑ ہوتے ہیں۔

مَهْدِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصٰدِقُونَ ۝ (۲۷/۴۹)

انہوں نے باہمی مشورہ کیا اور ایک دوسرے سے کہا کہ قسم اٹھاؤ کہ ہم سب مل کر صالح اور اس کے ساتھیوں پر رات کو حملہ کریں گے اور پھر مقتولین کے ورثاء کے سامنے صاف مکر جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہم نے انہیں ہلاک ہوتے دیکھا تک نہیں۔ ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔

اس سے آپ اندازہ کر لیجئے کہ انہوں نے تخویف و ترہیب کی کس قدر دہشت انگیز فضا پیدا کر رکھی تھی اور ان کے عزائم کیا تھے؟ یہ تھا حضرت صالحؑ کی تذکیر و تلقین کا ردِّ عمل!

اس کے بعد ہمارے سامنے حضرت ابراہیمؑ آتے ہیں۔ ان کی تو ساری زندگی اسی کشمکش کی لرزہ انگیز داستان ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان! ذرا سوچئے تو سہی آپ کا مسلک کیا ہے؟ آپ اپنے ہاتھ سے ایک بت تراشتے ہیں اور پھر اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ عقل و شعور کی دنیا میں کیا اس مسلک کو معقول کہا جا سکتا ہے؟ باپ کی طرف سے اس کا جواب کیا ملا؟ یہ کہ: لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا..... (۱۹/۴۶) اسے کان کھول کر سن لو۔ اگر تم ان باتوں سے باز نہ آئے تو میں تمہیں دھتکار دوں گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ان تمام مناصب و املاک سے، جو تمہیں ورثہ میں ملنے والی ہیں، محروم ہو جاؤ گے۔ اگر تم اپنی خیر چاہتے ہو تو میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جاؤ۔

آپ کو معلوم ہے حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے اس دھمکی کا جواب کیا ملا تھا؟ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۖ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي..... (۱۹/۴۷) میری آرزو یہ ہے کہ آپ صحیح راستہ اختیار کر کے امن و سلامتی سے رہیں۔ میں خدا سے دعا کرتا رہوں گا کہ آپ کو ایمان عطا ہو اور اس طرح آپ کفر و شرک کی وجہ سے آنے والی تباہیوں سے محفوظ رہیں۔

اس کے بعد جب آپ نے یہی تلقین اپنی قوم سے کی تو ان کی آتشِ انتقام کے شعلے آسمان گیر ہو گئے۔ قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوا آلِهَتَكُمْ..... (۲۱/۶۸)۔ "انہوں نے عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور ان سے کہا کہ اگر تم میں غیرت و حمیت کی کوئی رمق بھی باقی ہے تو اٹھو اور اس شخص کو زندہ جلا دو۔"

قومِ لوط جس فعلِ شنیع کو اپنی روش بنائے ہوئے تھی، اس کے تصور تک سے گھن آتی ہے۔ حضرت لوطؑ نے..... نہایت شفقت اور نرمی سے اس روش کی تباہ کاریوں کے متعلق انہیں سمجھایا اور اس سے باز رہنے کی تلقین کی۔ ان کی اس تلقین و تذکیر کا جواب یہ تھا کہ أَخْرِجُوهُمْ مِّن قَرْيَتِكُمْ ۖ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ۝ (۷/۸۲)۔ "انہوں نے کہا کہ یہ لوگ بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں۔ انہیں اپنی بستی سے نکال باہر کرو۔"

حضرت شعیبؑ قومِ مدین کی طرف مبعوث ہوئے جنہوں نے اپنے ہاں کے اقتصادی نظام کو بُری طرح بگاڑ رکھا تھا۔ انہوں نے اس کی اصلاح کی کوشش کی اور سمجھایا کہ اس کا نتیجہ کس قدر

ہلاکت آفریں ہوگا۔ اس کے جواب میں مستکبرین قوم نے کہا کہ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ..... (۷/۸۸) "اے شعیبؑ! ہم لمبی چوڑی باتیں نہیں کرنا چاہتے۔ تم اور تمہاری جماعت کے افراد، یا تو ہمارا مسلک اختیار کرلیں، ورنہ ہم تم سب کو اپنی بستی سے نکال دیں گے۔ اس کے بعد تم خود فیصلہ کرلو کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟

حضرت موسےٰؑ اور فرعون کی کشمکش تو دنیا کی تاریخ کا اہم حصہ بن چکی ہے۔ انہوں نے بڑی نرمی سے فرعون سے کہا کہ بنی اسرائیل کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھنا خلافِ انسانیت ہے اور دلائل و قرائن سے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کے عواقب خود اس کے حق میں اچھے نہیں ہوں گے۔ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ: لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۝ (۲۶/۲۹) "اگر تم نے یہ دعویٰ کیا کہ یہاں کا حاکم میں نہیں، کوئی اور ہے، تو سمجھ رکھو کہ تمہارا ٹھکانہ جیل خانہ ہوگا! قوم حضرت موسےٰؑ کی دعوت پر لبیک کہنے کے لئے تیار تھی لیکن فرعون نے ان پر اس قدر خوف طاری کر رکھا تھا کہ وہ اس کی جرأت نہیں کر سکتے تھے (عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ ..... (۱۰/۸۳)۔ جب دربارِ فرعون کے مذہبی پیشوا (پروہت) حضرت موسےٰؑ کی براہینِ نیرہ سے متاثر ہو کر ان کی دعوت کی صداقت کے قائل ہوگئے تو فرعون ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجا اور کہا کہ: اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ..... (۷/۱۲۳)۔ ہیں: میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں!! تم نے میری اجازت کے بغیر ہی موسےٰؑ کی دعوت کی صداقت کو تسلیم کرلیا! تم دیکھو کہ میں تمہارا حشر کیا کرتا ہوں۔ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (۷/۱۲۴) میں تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوا تا ہوں اور پھر تم سب کو سولی پر چڑھاتا ہوں!

حضرت مریمؑ نے ہیکل کی عائد کردہ ناروا پابندیوں کو توڑا تو انہوں نے ان پر عرصۂ حیات اس قدر تنگ کر دیا کہ انہیں اپنے بچے کو لے کر، اور دیس چھوڑ کر چلے جانا پڑا۔ اور پھر خود حضرت عیسےٰؑ کے خلاف جو کچھ کیا اس سے کون واقف نہیں۔ آپ انجیل میں حضرت عیسےٰؑ کے وعظ دیکھئے۔ کس قدر دلائل و شواہد پر مبنی اور حسین و دلکش تشبیہات سے مزین ہیں۔ یہودیوں کی طرف سے اس قسم کے مواعظ کا جواب صلیب تھا!

(۰)

ظہورِ اسلام

انسان، تاریخ کی اس دہلیز پر کھڑا تھا جب حضور رحمۃ اللعالمینؐ کی بعثت اور قرآن کا نزول ہوا۔ خوف و ہراس کا مارا ہوا انسان، ڈرا اور سہما ہوا انسان! اس انسان سے قرآن نے کہا کہ اب خوف اور ہراس کا دور ختم ہوا۔ اب تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہے سیدھا راستہ۔ اس پر چلتے جاؤ تو تمہیں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۲/۳۸)

جو ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چلتا جائے گا۔ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

آپ قرآن کی دفتین کو کھول کر دیکھئے۔ قدم قدم پر آپ کو یہ بشارتِ عظمیٰ درخشندہ حروف میں لکھی ملے گی کہ ـــــ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

قبل اس کے کہ ہم ان مقامات کو سامنے لائیں جہاں قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ وہ کونسے اسباب ہیں جن سے خوف اور حزن لاحق ہوتا ہے، اور کونسے اقدامات جن سے ان سے تحفظ حاصل ہوتا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ کا مفہوم واضح کر دیا جائے جنہیں قرآن نے ساتھ ساتھ استعمال کیا ہے۔

خوف اور حزن کا مفہوم

بدیہی طور پر ان الفاظ کو مرادف المعنی سمجھا جاتا ہے اور ان کا مفہوم ڈر لیا جاتا ہے لیکن سطح سے ذرا نیچے جا کر دیکھیں تو ان دونوں میں بڑا لطیف فرق نظر آئے گا۔ عام فہم الفاظ میں، خوف کے متعلق یوں سمجھئے کہ یہ اس خطرہ کا پیدا کردہ احساس ہوتا ہے جو محسوس طور پر سامنے آجائے۔ جنگل میں سفر کرتے وقت اگر شیر کے دھاڑنے کی آواز کانوں میں آجائے، یا اژدہا پھنکار رہا ہو تو ہم ڈر جاتے ہیں۔ یہ محسوس خوف کی مثال ہے۔ یا ایسا خطرہ جس کی توجیہہ سمجھ میں آجائے۔ گھر کی بوسیدہ چھت کے نیچے بیٹھے، یا سوتے وقت ہم ڈرتے ہیں کہ وہ کہیں گر نہ پڑے۔ یہ بھی خوف ہے۔ لیکن حزن، دل کی اس دردانگیز افسردگی اور اندوھناک آزردگی کا نام ہے جسے ہم نہ کسی کو دکھا سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے۔ اور اکثر اوقات تو اس کا کوئی سبب خود ہماری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتا، چہ جائیکہ ہم اسے دوسروں کو سمجھا سکیں۔ اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: ؎

ہے کوئی بات آج ہونے کو!
جی بہت چاہتا ہے رونے کو

خوف کے اسباب محسوس ہوتے ہیں اس لئے اس کی مدافعت محسوس طور پر کی جا سکتی ہے، لیکن حزن درحقیقت انسان کے لاشعور میں دبے ہوئے خطرات کے پیدا کردہ رنج و الم اور اندوہ و ملال کا نام ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید کے انگریزی تراجم میں خوف کا ترجمہ (FEAR) اور حزن کا (GRIEF) کیا جاتا ہے۔ ذہنی طور پر تو ان الفاظ کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے مگر حزن سے جو چوٹ دل پر پڑتی ہے، وہ ابھر کر سامنے نہیں آتی لیکن اندر ہی اندر مغزِ استخواں تک کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے مرزا مظہر جانِ جاناں کا ایک بڑا خوبصورت لیکن عمیق شعر ہے جس میں خوف اور حزن کے اثرات کو بڑے لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ؎

صدائے تیشہ کہ بر سنگ می خورد دگر است
خبر بگیر، کہ آوازِ تیشہ و جگر است!

جب تیشہ پتھر پر پڑتا ہے، اس کی آواز میں، اور جب وہ جگر پر پڑتا ہے، اس کی صدا میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ صدا نہ کسی کو سنائی جا سکتی ہے، نہ اس کی چوٹ کسی کو دکھائی جا سکتی ہے۔ ریاض خیرآبادی نے اسے اپنے شوخ انداز میں یوں تعبیر کیا ہے کہ: ؎

کیسے بتائے کوئی خونِ آرزو کیا ہے!
انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ و بو کیا ہے[1]

"مستبد حاکم قید نہ کر دے" — یہ خوف ہے — "وہ کہیں بے عزتی نہ کر دے" — یہ حزن ہے — دل کی اس کیفیت کو نہ سمجھ سکنے والے عام طور پر کہا کرتے ہیں کہ تم اس قدر ملولِ خاطر کیوں ہو؟ اس نے تمہیں تھپڑ تو نہیں مار دیا۔ قید تو نہیں کر دیا۔ پھانسی کے تختہ پر تو نہیں لٹکا دیا۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ تذلیلِ انسانیت، تھپڑ، قید، حتیٰ کہ پھانسی سے بھی زیادہ اذیت رساں اور کرب انگیز ہوتی ہے۔ یہ خوف نہیں حزن ہے۔

ایک اور مثال میں یوں سمجھئے کہ ایک شخص کسی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے سزا کا ڈر ہوتا ہے۔ یہ خوف ہے۔ اس کے برعکس ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے فلاں درگاہ پر ایک منت مانی تھی جسے میں نے پورا نہیں کیا۔ اب مجھے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ خدا معلوم مجھ پر کونسی آفت آ جائے — یہ حزن ہے — اسے آپ نفسیاتی اضطراب کہہ سکتے ہیں۔

خوف اور حزن کے فرق کی اور مثالیں بھی ہیں۔ انہیں ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ سرِدست اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ قرآنِ کریم اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ اگر تم اس کے متعین کردہ راستے پر چلو گے تو نہ تمہیں کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن — خوف سے محفوظیت کا نتیجہ امن ہوتا ہے، اور حزن سے مامونیت سے اطمینان حاصل ہوتا ہے — اتباعِ قرآن کا لازمی نتیجہ امن اور اطمینان ہوتا ہے۔

———— (٠) ————

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، قرآنِ کریم نے پہلی ہی سورۃ (سورۂ بقرہ) میں، قصۂ آدم بیان کرتے ہوئے، نوعِ انسان (بنی آدم) سے کہا ہے کہ تم سے اگر کوئی لغزش ہو جائے تو اس سے مایوس ہو جانے کی کوئی بات نہیں۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ (۲/۳۸)؛ (۲/۳۵)

نہ خوف نہ حزن — ہماری طرف سے، تمہیں راہنمائی ملا کرے گی۔ جو بھی اس راہنمائی کا اتباع کرے گا، اسے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا' نہ حزن۔

دیگر مقامات پر اسے مختلف انداز سے دہرایا گیا ہے، مثلاً

---

[1] میں نے اس موضوع پر اپنے ایک اور مقالہ میں بھی گفتگو کی ہے جس کا عنوان تھا "کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔"

(۲) اسی سورۂ (بقرہ) میں کہا گیا ہے کہ دُنیا کی کوئی قوم ہو اور کسی مذہب کی پیرو، جو بھی قرآن کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق ایمان لائے گا اور اس کے کام قرآنی معیار کے مطابق صالح ہوں گے تو

فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

(۲/۶۲) ز (۵/۶۹)

اُن کا اجر ان کے رب کے ہاں سے ملے گا۔ اور وہ اجر یہ ہوگا کہ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن۔

(۳) ذرا آگے چل کر کہا کہ

مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۱۱۲)

جس نے بھی قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور پھر قرآنی معیار کے مطابق حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی، تو خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے اسے اس کا اجر مل جائے گا۔ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

(۴) سورۂ انعام میں، اسے اختصاراً بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

فَمَنْ آمَنَ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۶/۴۸)

جو قرآنی حقائق پر ایمان لے آیا اور اعمالِ صالح ہوئے، تو اسے نہ خوف ہوگا نہ حزن۔

(۵) سورۂ بقرہ میں ایمان اور اعمالِ صالح کے بعد فرمایا: وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ ..... وہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں، تو ان کا اجر اُن کے رب کے ہاں سے ملیگا۔ وہ اجر کیا ہوگا؟ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۲۷۷)۔ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن۔

(۶) اس سے دو ہی آیات پہلے کہا:۔

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۲۷۴)

جو لوگ نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے اپنا مال، دن رات، کھلے بندوں اور خاموشی سے، خرچ کرتے ہیں۔ ان کا اجر ان کے رب کے ہاں سے ملتا ہے۔ اور وہ اجر یہ ہوتا ہے کہ نہ کسی قسم کا خوف ان پر مسلط ہوتا ہے، نہ حزن دامنگیر۔

(۷) قرآن کریم نے بتایا ہے کہ مومنانہ زندگی جس کا فطری نتیجہ خوف سے تحفظ اور حزن سے مامونیت ہوتا ہے، کسی ہنگامی پروگرام کا نام نہیں۔ یہ عمر بھر کا اندازِ زیست اور مسلکِ حیات ہے۔ پھر یہ راہ پھولوں کی سیج نہیں۔ اس میں قدم قدم پر طاغوتی طاقتوں کے ساتھ ٹکراؤ ہوگا۔ یہ مراحل بڑے صبر آزما اور ہمت طلب ہوں گے۔ اس کے لئے بڑی استقامت کی ضرورت ہوگی۔ فرمایا: اِنَّ

اَلَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا..... جو لوگ اس حقیقت کو علیٰ وجہ البصیرت تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان کا نشوونما دینے والا، اللہ ہے۔ وہ اس کے لئے کسی انسان کے محتاج نہیں۔ اور پھر اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہیں کرتی۔ تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ..... ان پر "ملائکہ" کا نزول ہوتا ہے ــــ ملائکہ نازل ہو کر کیا کرتے ہیں؟ ان سے کہتے ہیں کہ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا..... تم کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ اس طرح انہیں خوشخبری دیتے ہیں اُس جنت کی جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے: وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ (۴۱/۳۰)۔ دوسری جگہ اسی حقیقت کو ذرا اختصار کے ساتھ دہرایا گیا ہے۔ (دیکھئے ۴۶/۱۳)

آگے بڑھنے سے پہلے اس اہم نقطہ پر غور کیجیے کہ جنتی زندگی کی اہم خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس

جنتی زندگی

میں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن۔ مکافاتِ عمل کی رُو سے جنہیں جنت کا مستحق قرار دیا جائے گا ان سے کہا جائے گا کہ یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝ (۴۳/۶۸) "اے میرے بندو! اب تمہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن۔ اُدْخُلُوا الْجَنَّۃَ..... (۴۳/۷۰)۔ تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔ (نیز ۱۵/۴۵) وہ اس زندگی میں دل کی کشاد سے پکار اٹھیں گے:۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ط اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَکُوْرٌ ۝ (۳۵/۳۴)

وہ اس زندگی کی اندوہ ربا اور طمانیت بخش فضاؤں کو دیکھ کر والہانہ طور پر پکار اٹھیں گے کہ کس قدر درخورِ حمد و ستائش ہے۔ وہ ذات جس نے ہماری پریشانیوں اور افسردگیوں (حزن) کو دُور کر دیا۔ اس قسم کا تحفظ عطا کر دینا اُسی کے لئے ممکن تھا۔ وہ اپنے بندوں کی محنت کا کس قدر بھرپور صلہ دیتا ہے۔

جس زندگی میں نہ خوف ہو نہ ہراس (اندوہ و غم) وہ جنت کی زندگی ہے۔ واضح رہے کہ خوف و حزن سے مامونیت، مومنانہ زندگی کا منتہیٰ نہیں۔ اس میں وہ امن و اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جس میں انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کی سعی و کاوش بارآور ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن میں بیان کردہ جنت کی زندگی میں، خوف و حزن سے مامونیت کے بعد بے شمار مثبت نعمائے حیات کا بھی ذکر ہے۔ بالفاظِ دیگر، خوف و حزن سے مامونیت وہ فضا پیدا کرتی ہے جس میں انسانی صلاحیتیں پرورش پاتیں اور بروئے کار آتی ہیں۔ یہ اس کے لئے شرطِ لابنفک اور قدمِ اوّل ہے۔ اس جنتی فضا میں پرورش پانے والے سعادت مند اور خوش نصیب

اولیاء اللہ

افراد کو وہ مومن کہہ کر پکارتا ہے اور انہیں "خدا کا دوست" قرار دیتا ہے۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (۱۰/۶۲)۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوتا ہے، نہ حزن۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ یہ جماعتِ مومنین ہی کی ایک صفت ہے۔ قرآن کی رُو سے ہر مومن، ولی اللہ ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ کا الگ گروہ، تصوّف کا پیدا کردہ تصوّر ہے۔ قرآن سے اس کی کوئی سند نہیں ملتی۔

حُزن کا ایک اور مفہوم

یہاں تک ہم نے دیکھ لیا کہ قرآنی تعلیم کا ماحصل ایک ایسا معاشرہ پیدا کرنا ہے جس میں کسی کو نہ کسی سے کچھ خوف ہو، نہ حزن۔ قبل اس کے کہ ہم اس موضوع تک پہنچیں کہ خوف اور حُزن پیدا کس طرح کیا جاتا ہے اور قرآن، اس سے مامونیت کا کیا طریق بتاتا ہے، لفظ حُزن کا ایک اور مفہوم ایسا ہے جسے سمجھے بغیر نہ وہ بنیادی سبب سامنے آسکتا ہے جس کا نتیجہ حزن ہوتا ہے، نہ اس کے ازالہ کی صورت۔

عربی لغت میں حزن اس پریشانی کو بھی کہا جاتا ہے جو افلاس اور محتاجی سے پیدا ہو۔ چنانچہ عرب "حزانۃ الرجل" کسی کے ان بیوی بچوں کو کہتے تھے جن کی روٹی کی فکر سے وہ پریشان ہو۔ وہ مزدور جس کے گھر میں رات کی روٹی کا سامان نہ ہو۔ وہ مزدوری کی تلاش میں گھر سے نکلے لیکن اسے کوشش بسیار کے باوجود مزدوری نہ مل سکے۔ وہ جس آتشِ خاموش کو دل میں لئے گھر کی طرف لوٹے گا، اسے حُزن سے تعبیر کیا جائے گا۔ عربی لغت کی مستند کتاب تاج العروس میں ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں اہلِ جنت کے متعلق کہا ہے کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں ان الفاظ میں ہدیۂ تشکر پیش کریں گے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (۳۵/۳۴) "درخورِ حمد و ستائش ہے وہ ذات جس نے ہمارا حزن دور کر دیا" تو اس سے مراد یہ ہے کہ قابلِ حمد و ستائش ہے وہ ذات جس نے ہمیں فکرِ معاش سے نجات دلائی۔ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ (۳۵/۳۵) اس زندگی میں ہمیں نہ حصولِ رزق کے لئے جگر پاش مشقتیں اُٹھانی پڑتی ہیں، اور نہ ہی ذہنی کاوش اور نفسیاتی افسردگی کا شکار ہونا پڑتا۔" یہ خصوصیت ہوتی ہے اس معاشرہ کی جو نظامِ خداوندی کی رُو سے قائم ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو بھی ذہن میں رکھئے کہ قرآن کی رُو سے، جنّت کی زندگی اسی دنیا سے شروع ہو جاتی ہے اور اُخروی زندگی تک ساتھ جاتی ہے۔ اس دُنیا میں جنتی زندگی، نظامِ خداوندی کے زیرِ سایۂ عاطفت حاصل ہوتی ہے۔

(۰)

اب آیئے اس موضوع کی طرف کہ خوف و حزن پیدا کس طرح کیا جاتا ہے، اور قرآنِ کریم کی رُو سے اس کا علاج کیا ہے؟ آپ عالمِ انسانیت کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے بالعموم، اور ان اقوام کی تاریخ پر بالخصوص جن کی داستانیں قرآن میں بیان ہوئی ہیں، اور جن کا اشاراتی تذکرہ سابقہ صفحات میں سامنے آچکا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ خوف و حزن پیدا کرنے کے دو ہی ذرائع ہیں۔ جن لوگوں نے کسی طرح اتنی

قوت حاصل کرلی جو عوام کے پاس نہیں تھی، انہوں نے اپنی حکومت قائم کرلی اور عوام کو اپنا محکوم بنا لیا۔ اس حکومت کے استحکام اور بقا کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ یعنی عوام پر خوف کی فضا مسلسل طاری رکھنا۔ خوف کی ایسی جانگسل فضا کہ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ... (۱۴/۱۷) "انہیں چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دے لیکن وہ مریں نہیں"۔ اگر قاہر و جابر ارباب اقتدار خوف کو اس قدر شدید کر دیں کہ عوام موت کا شکار ہو جائیں تو پھر یہ حاکم، حکومت کس پر کریں؟ اس لئے وہ انہیں زندہ ضرور رکھتے ہیں، اسی طرح جیسے قصاب اپنے بکروں کو زندہ رکھتا ہے۔

ارباب تغلب کا دوسرا حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ وسائل رزق کو اپنے کنٹرول میں رکھتے ہیں اور بھوک اور احتیاج کے کوڑے سے "سرکس کے شیر" کو لومڑی بنا دیتے ہیں۔ اس طرح خوف اور حزن کی فضا کو مسلسل قائم رکھتے ہیں۔ قرآن کریم نے استبداد اور استحصال دونوں کے لئے فرعون مصر کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ اس کی مملکت میں ___ خوف کی جو کیفیت تھی اس کے متعلق ہم سابقہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں۔ خود حضرت موسیٰؑ کی قوم (بنی اسرائیل) اس کے خوف کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کی دعوت پر لبیک نہیں کہتی تھی۔ (عَلَىٰ خَوْفٍ مِّن فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِمْ أَن يَفْتِنَهُمْ ... ۱۰/۸۳)۔ دوسری طرف، جب خود اس کی قوم کے پروہتوں نے، جو اس معاشرہ میں بلند ترین مقام پر فائز ہوتے تھے، حضرت موسیٰؑ کی صداقت کو تسلیم کر لیا تو فرعون کے قہر اور غضب نے جو طوفان برپا کیا، اسے بھی ہم دیکھ چکے ہیں۔

جہاں تک رزق کے چشموں پر اقتدار کا تعلق ہے، جب فرعون کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ عوام حضرت موسیٰؑ کی دعوت سے متاثر نہ ہو جائیں، تو اس نے ملک میں اعلان کیا کہ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي ۖ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ (۴۳/۵۱)۔ "اے لوگو! سوچو کہ کیا اس ملک کی زمینیں اور ان میں بہنے والی نہریں، میری ملکیت نہیں ہیں؟ ... ذرا عقل و ہوش سے کام لو کہ اگر میں نے رزق کے یہ دروازے تم پر بند کر دیئے تو تمہارا حشر کیا ہوگا؟ أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ وَلَا يَكَادُ يُبِينُ ۝ (۴۳/۵۲)۔ اس مفلس و قلاش کے پاس ہے کیا جو تمہیں میرے خلاف اکسا رہا ہے۔ اسے تو سلیقے سے بات بھی کرنی نہیں آتی! أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (۷۹/۲۴) تمہارا رزق میرے ہاتھ میں ہے۔ میں تمہارا "ان داتا" ہوں۔ یہ ہوتے ہیں ارباب تغلب و استبداد کے وہ حربے جن سے وہ ملک میں خوف و ہراس کی فضا قائم رکھتے ہیں اور عوام کے جوہر انسانیت کو کچل کر رکھ دیتے ہیں کہ وہ اٹھنے نہ پائیں۔

(۰)

محکومی سے نجات

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، یہ تھی عالمگیر انسانیت کی حالت جب اسلام کا ظہور، یعنی قرآن کا نزول اور حضور نبی اکرمؐ کی بعثت ہوئی۔ اس لئے حضورؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي

كَانَتْ عَلَيْهِمْ ..... (۷/۱۵۷)۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں نوعِ انسان جکڑے چلی آرہی تھی اور ان بھاری بھرکم سلوں کو ان کے سر سے اتار پھینکے گا جن کے تلے وہ دبی ہوئی تھی۔ اس نے اسلام کا مقصود و منتہیٰ دو لفظوں میں بیان کر دیا۔ فَكُّ رَقَبَةٍ ..... (۹۰/۱۳) وہ نوعِ انسان کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ ڈالے گا۔

اس مقام پر ایک اور نکتہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے۔ خوف تو محسوس اسباب کا پیدا کردہ ہوتا ہے اس لئے اس کا سمجھ لینا مشکل نہیں۔ حزن سے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ محسوس نہیں ہوتے۔ آج کی اصطلاح میں آپ انہیں (PSYCHOLOGICAL COMPLEXES) کہہ سکتے ہیں۔ لیکن زمانہ نزولِ قرآن میں نہ نفسیاتی امراض کی طرف کسی کا خیال گیا تھا۔ نہ ہی ان کے لئے کوئی اصطلاحات وجود میں آئی تھیں۔ یہ قرآن کا اعجاز اور بلاغت ہے کہ اس نے ان امراض کو "دل کے روگ" کہہ کر پکارا ہے جب کہا کہ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ ..... (۲/۷) اور قرآن کے متعلق کہا کہ وہ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ ..... (۱۰/۵۷) ہے۔ یعنی دل کے امراض کو شفا بخشنے والا۔

اس لحاظ سے دیکھئے تو قرآن نے خوف اور حزن، دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ ویسے حزن (یا دل کے روگ) بھی خوف ہی کے پیدا کردہ احساسات ہوتے ہیں جو تحت الشعور میں چھپے رہتے ہیں۔

قرآن کریم نے خوف کے شجرۃ الزقوم کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جب کہا کہ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔ لا الٰہ کے معنی ——— یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی انسان صاحبِ اقتدار نہیں ہو سکتا۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ حکومت کے بغیر انسانی معاشرہ قائم کیسے رہ سکے گا؟ اس سے تو فوضویت (انارکی) پھیل جائے گی۔

نظامِ حکومتِ خداوندی

کہا کہ حکومت تو ہو گی لیکن اس میں حکمرانی قانون کی ہو گی۔ کسی انسان کی نہیں ہو گی۔

سوال پیدا ہوا کہ ہم نے قانون کی حکمرانی کو بھی دیکھ لیا ہے۔ اس میں بھی خوف اور حزن کے اسباب کی کمی نہیں ہوتی۔ اس میں ایک شخص یا چند اشخاص کے فیصلوں کو قانون کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اور ان کی خلاف ورزی کی پاداش میں ایسی لرزہ انگیز سزائیں رکھی جاتی ہیں جن سے معاشرہ پر خوف طاری رہے۔ اور چونکہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کل کو کس قسم کا قانون نافذ کر دیا جائے اور اس کی گرفت میں کون کون آجائے، یا اسے کونسی پچھلی تاریخ سے نافذ کر دیا جائے۔ اس سے ہر شخص کے اعصاب پر حزن مسلط رہتا ہے۔ قانون کی حکمرانی میں، بہترین طریق مغرب کا جمہوری نظام قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں اکثریت کے ہاتھوں اقلیت کا جو حشر ہوتا ہے اس پر ان ممالک کے اربابِ دانش کی آہ و بکار شاہد ہے۔ لہٰذا، قانون کی حکمرانی میں خوف اور حزن سے مامونیت کس طرح حاصل ہو جائے گی؟

جواب دیا کہ اس میں قوانین، انسانوں کے وضع کردہ نہیں ہوں گے۔ خود خدا کے متعین فرمودہ ہوں گے جیسے اس نے اپنی کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ لہٰذا، اس نظامِ حکومت میں، حکمرانی کتاب اللہ کی ہوگی۔ ان قوانین کی خصوصیت یہ ہوگی کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔ یہ مکمل بھی ہوں گے اور غیر متبدل بھی۔ (۶/۱۱۶)

ان قوانین کی عام اشاعت کر دی جائے گی اور ہر ایک سے کہہ دیا جائے گا کہ وہ انہیں اچھی طرح سمجھ کر فیصلہ کرے کہ وہ ان کے تابع زندگی بسر کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اس میں کسی قسم کا جبر اور جور نہیں ہوگا۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲/۲۵۶) کا یہی مطلب ہے۔ جو ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کریں گے وہ جماعتِ مومنین کے افراد کہلائیں گے۔ اس نظام کا قیام و استحکام اور نظم و نسق انہی کے ذمے ہوگا۔ جو ایسا نہیں چاہیں گے انہیں اجازت ہوگی کہ وہ چاہیں تو کسی اور ملک کی طرف چلے جائیں اور چاہیں تو، ان شرائط کے مطابق جو انہیں واضح طور پر بتا اور سمجھا دی جائیں گی۔ اسی مملکت میں رہیں۔ خوف اور حزن سے مامونیت کی ضمانت انہیں بھی دی جائے گی۔ ان کی جان، مال، عزت، آبرو، عصمت کی حفاظت قرآنی مملکت کے ذمہ ہوگی (اسی اعتبار سے انہیں ذمّی کہا جاتا ہے) الدین (قرآنی نظام) تو انہوں نے اختیار نہیں کیا تھا، لیکن انہیں ان کے مذہب کی آزادی ہوگی ـــــ مذہبی اعتقادات۔ پرستش کے رسوم و مناسک وغیرہ۔ ان کے معابد کی حفاظت بھی اس مملکت کی ذمہ داری ہوگی۔ اس لحاظ سے آپ نے دیکھا کہ اس مملکت میں خوف و حزن کسی کو بھی نہیں ہوگا ـــــ نہ مسلموں کو نہ غیر مسلموں کو۔

اس مقام پر ایک اور سوال پوچھا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآنی احکام، اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی، عطا فرمائے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے غیر متبدل ہیں کہ انہیں کوئی انسان تبدیل نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ انہیں کسی وقت خود خدا بذریعہ وحی تبدیل نہ کر دے!

اس سوال کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ اس وقت آپ کو اختیار ہوگا کہ جی چاہے تو ان تبدیل شدہ احکام کو تسلیم کریں، اور جی چاہے تو ان سے انکار کر کے غیر مسلموں کے زمرے میں شمار ہو جائیں۔

ختمِ نبوّت

لیکن اس کا حقیقی جواب یہ ہے کہ جس خدا نے خوف و حزن سے مامونیت کی ضمانت دی ہے اسی نے یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ وحی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا، قرآنی احکام، قیامت تک کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ ختمِ نبوّت درحقیقت انسانی حریت اور آزادی کا عظیم انقلاب آفریں اعلامیہ ہے۔ علامہ اقبالؒ اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> اسلام کا ظہور استقرائی فکر (INDUCTIVE INTELLECT) کا ظہور ہے۔ اس میں نبوّت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس کی تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت

کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لئے عہدِ طفولیت کی ڈوریوں سے باندھے نہیں رکھا جا سکتا۔ انسان کو شعورِ خویش کی منزل تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے اس کی اپنی صلاحیتوں کے سہاروں پر چھوڑ دیا جائے اسلام نے مذہبی پیشوائیت اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن مجید غور و فکر اور تجربات و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علم انسان کے ذرائع ٹھہراتا ہے یہ سب ختمِ نبوت کے نظریہ ہی کے مختلف گوشے ہیں..... عقیدۂ ختمِ نبوت کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ اب نوعِ انسان کی تاریخ میں کوئی شخص اس کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی فوق الفطرت اتھارٹی کی بناء پر دوسروں کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا ہے۔ ختمِ نبوت کا عقیدہ ایک ایسی نفسیاتی قوت ہے جو اس قسم کے دعوائے اقتدار کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ (پانچواں خطبہ۔ صفحہ ۱۲)

وہ اپنے چھوٹے خطبہ کے خاتمہ پر کہتے ہیں:۔

اس عقیدہ کی حامل قوم کو دنیا میں سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ (صفحہ ۱۷)

اس میں یہ کہا گیا ہے کہ اور یہ درحقیقت قرآن ہی کا اعلان ہے کہ ختمِ نبوت، انسانی حریت و آزادی کا منشور ہے۔ اس پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جماعتِ مومنین نے جب قرآنی احکام کا اتباع کرنا ہے جو ابدی اور غیر متبدل ہیں، تو اسے آزادی کس طرح کہا جائے گا؟

یہ سوال، قرآنی احکام کی حقیقت سے ناواقفیت سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں (بجز چند احکام) اصول و اقدار دیئے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان اصول و اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، جزئی قوانین خود وضع کرے۔ بالفاظِ دیگر، یوں کہئے کہ قرآنی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ اُمت کے مشورہ سے، ان اصول و اقدار کے نافذ کرنے کے طریق وضع کرے۔ انہیں شریعتِ اسلامیہ کہا جائے گا۔ یہ قرآنی اصول و اقدار، غیر متبدل رہیں گے اور اُمت کے وضع کردہ جزئی احکام، یا طور طریق حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے۔ لفظ شریعت کے معنی ہیں ایسا راستہ جو اس ندی کی طرف لے جائے جو رواں دواں (بہنے والی) ہو۔ مغربی جمہوریت اور قرآنی نظام میں یہ بنیادی فرق ہے۔ مغربی جمہوریت میں مقننہ کے قانون سازی کے اختیارات غیر محدود ہوتے ہیں۔ یعنی وہ جس قسم کے قانون چاہے وضع اور نافذ کر سکے۔ اسی لئے اس میں خوف اور حزن کا امکان مضمر ہوتا ہے۔ قرآنی نظام میں اُمت کی مشاورت محدود ہوتی ہے۔ قرآنی اصول و اقدار سے۔ یعنی وہ کوئی ایسا قانون مرتب نہیں کر سکتی جو قرآنی حدود سے متصادم یا متجاوز ہو۔ اس لئے ان قوانین میں خوف یا حزن کا امکان نہیں ہوتا۔

واضح رہے کہ مشاورت کا حکم وقتی یا ہنگامی نہیں۔ یہ قرآن کے ابدی، غیر متبدل اصولوں میں سے ہے، حتیٰ کہ رسول اللہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ حضورؐ کو بھی اس کا حکم دیا گیا تھا۔ (۳/۱۵۸) اُمت کے

متعلق جو کہا گیا کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ..... (۴۲/۳۸) "ان کے امورِ مملکت باہمی مشورہ سے طے ہوں گے"۔ تو قرآنی نظام کی یہ شرط ہنگامی یا وقتی نہیں۔ قرآن کے دیگر اصولوں کی طرح، یہ ابدی اور غیر متبدّل ہے۔ نظامِ مملکت سے متعلق کسی معاملہ میں بھی اگر مشاورت نہیں، تو وہ فیصلہ اسلامی نہیں ہوگا۔ اور یہ واضح ہے کہ جب امر مشروط ہے مشاورت سے، تو سربراہِ مملکت (امیر المؤمنین) کا تقرر بدرجۂ اولےٰ مشاورت سے مشروط ہوگا۔ ملوکیت، موروثی سلطنت یا آمریت اور قرآنی نظام میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ ..... قرآنی نظام میں سربراہ کے تقرر کے لئے مشاورت شرط ہے۔ اگر سربراہِ مملکت کا تقرر ہی قرآنی شرط پر پورا نہیں اترتا تو مملکت کا کوئی کاروبار اسلامی قرار نہیں پا سکتا، خواہ وہ قرآنی احکام کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔ کسی قانون کے اسلامی ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی مملکت کی طرف سے نافذ ہو، اور کسی مملکت کے اسلامی ہونے کی اساس و بنیاد یہ ہے کہ اس کا تمام کاروبار کتاب اللہ کے مطابق ہو۔ اس میں سربراہ کا تقرر خشتِ اوّل ہے۔ اگر خشتِ اوّل (بنیاد کی اینٹ) ہی ٹیڑھی ہے تو اس پر اٹھی ہوئی دیوار کس طرح سیدھی ہوگی۔

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج ! !

قرآنِ کریم نے مشاورت کا اصول دیا ہے۔ اس کا طریق خود متعین نہیں کیا۔ یہ طریقہ، حالات کے مطابق اُمّت خود طے کرے گی۔ یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کی رو سے، مملکت کسی خاص فرد، یا خاص گروہ کی ملکیت نہیں ہوتی۔ یہ پوری اُمّت کا قائم کردہ نظام ہوتا ہے۔ (علاوہ دیگر آیات) خود اَمْرُهُمْ میں هُمْ کی ضمیر ساری اُمّت کے لئے ہے۔

جب نظامِ مملکت میں ساری اُمّت شریک ہوگی اور اس نظام کا کاروبار ان کے باہمی مشورہ سے سرانجام پائے گا، تو اس میں خوف و حزن کا امکان نہیں ہوگا جو انسانوں کے خود ساختہ نظامِ مملکت کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس میں ایک بڑھیا بھی سربراہِ مملکت سے بے باکانہ کہہ سکے گی کہ فلاں فیصلہ پر نظرِ ثانی کیجئے کیونکہ وہ قرآن کے خلاف نظر آتا ہے۔ اور ایک لونڈی (اور تو اور) رسولؐ اللہ سے پورے اطمینان اور سکونِ قلب سے کہہ سکے گی کہ آپ کا یہ مشورہ اگر خدا کا حکم ہے تو سرِ تسلیم خم ہے۔ اور اگر آپ کا ذاتی مشورہ ہے تو مجھے اس کی تعمیل سے معاف رکھئے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ مشاورت کا حکم وقتی یا ہنگامی نہیں۔ یہ ابدی حکم ہے جس کا اطلاق ہر زمانے کی اسلامی مملکت پر یکساں ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی سابقہ زمانے کی اسلامی مملکت کے، مشاورت کی رُو سے طے شدہ جزئی قوانین اُس زمانے کے لئے شرعی احکام کہلا سکیں گے۔ آنے والے زمانے کی اسلامی مملکت پر ان کی پابندی لازم نہیں ہوگی۔ وہ خود اپنے طریقِ مشاورت سے ان احکام کو وضع اور نافذ کرے گی۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو کسی سابقہ زمانے کے فقہی احکام، آنے والے زمانے کے لئے، غیر متبدّل احکامِ شریعت قرار نہیں پا سکتے۔ یوں بھی، قرآنِ کریم نے صرف کلمات اللہ (خدا کے احکام) کو

غیر متبدّل کہا ہے۔ اگر انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدّل سمجھ لیا جائے تو یہ انہیں خدائی صفت سے متصف کر دینے کے مرادف ہوگا جو شرک ہے۔ جہاں تک متداول فقہی احکام کا تعلق ہے، یہ تو کسی اسلامی مملکت میں مشاورت کی رو سے مرتب بھی نہیں ہوتے تھے۔ یہ دورِ ملوکیت میں، بعض قانون دان حضرات نے اپنی صوابدید کے مطابق مرتب کئے تھے۔ یہ اس اعتبار سے بھی ہمارے دور میں اسلامی نہیں کہلا سکتے۔ ہمارے دور میں اسلامی احکام اس طرح مرتب ہوں گے کہ

(۱) سب سے پہلے مملکت اسلامی ہو۔ یعنی وہ اعلان کرے کہ اس کا سب کاروبار کتاب اللہ کے مطابق ہوگا۔

(۲) اس کی مشاورتی تنظیم، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصول و اقدار کو نافذ کرنے کے لئے طریق وضع کرے گی۔ یہ جزئی قواعد ہمارے لئے احکامِ شریعت قرار پائیں گے۔ چونکہ یہ ہمارے اپنے وضع کردہ ہوں گے اور جن اسباب و وجوہ کی بنا پر انہیں وضع کیا جائے گا، وہ بھی ہمارے سامنے ہوں گے، اس لئے اُن سے خوف و حزن پیدا نہیں ہوگا۔ ہزار سال پہلے کے قانون دان حضرات کے وضع کردہ فقہی احکام کو احکامِ شریعت کی حیثیت سے نافذ کر دینے کا جو نتیجہ ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

(۰)

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ خوف اور حزن سے مامونیت صرف اس نظام میں ممکن ہے جس کا تمام کاروبار خالص کتاب اللہ کے مطابق ہو۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔ اگر اس میں انسانوں کے خود ساختہ نظریات و قوانین کی ذرا سی بھی آمیزش ہو گئی تو وہ شرک ہو جائے گا۔ خدا اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖ أَحَدًا ..... (۱۸/۲۶)۔ وہ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ قرآنِ کریم نے حضرت ابراہیمؑ کے اسوہ کو ایک توحید پرست کی حیثیت سے بطورِ مثال پیش کیا ہے۔ وہ (نمرود جیسے) سراپا قہر و استبداد بادشاہ کو انتہائی جرأت و بیباکی سے متنبہ کرتے ہیں کہ تمہارا مسلک باطل ہے۔ اسی طرح وہ اپنی قوم سے برملا کہتے ہیں کہ وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ ..... (۶/۸۱) تم جنہیں شریکِ خدائی ٹھہراتے ہو، میں ان سے کیوں خوف کھاؤں۔ خائف تو تمہیں ہونا چاہیئے جو خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کرتے ہو۔ اس کے بعد فرمایا فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ..... (۲/۸۲) تم سوچو کہ تم میں اور مجھ میں سے، کسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ دعوےٰ کرے کہ اسے کسی کا ڈر نہیں۔ وہ کامل امن کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شرک کا لازمی نتیجہ خوف ہے۔ اسی بنا پر اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

شرک میں خوف

ہر کہ در رمزِ مصطفےٰ فہمیدہ است!
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

(رموزِ بیخودی صفحہ ۱۱۱)

اسے اچھی طرح سمجھ رکھیئے کہ شرک کے معنی ہیں انسانوں کی حکومت خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو۔ اور اس کا نتیجہ ہے خوف۔ اس سے انسان کس قدر پستیوں میں جا گرتا ہے اسے تشبیہاً سمجھانے کے لئے کہا کہ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ..... (۲۲/۳۱) جو اللہ کے حقِ حکومت میں کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے اس کی مثال یوں سمجھو جیسے کوئی شخص آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرے۔ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ پھر اسے کوئی چیل اُچک کر لے جائے۔ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۲۲/۳۱) یا جیسے گھاس کا کوئی تنکا ہو جسے تند و تیز ہوا اِدھر اُدھر اڑائے لئے پھرے اور کسی دور دراز مقام پر لے جا کر پھینک دے۔

آپ غور کیجئے کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی محکومیت اختیار کرنے والوں کا کس قدر عبرتناک نقشہ کھینچا گیا ہے۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا... ہم تو چاہتے تھے کہ یہ ہمارے نظام کے تابع زندگی بسر کر کے آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے۔ وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ..... (۷/۱۷۶) لیکن یہ شرک اختیار کر کے زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک گیا۔ یعنی انسانوں کی محکومیت اختیار کر کے انسان، شرف و احترامِ آدمیت کا مقام کھو بیٹھتا ہے اسی لئے فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ..... (۴/۱۱۶) خدا کے قانون کی مشیت کی رُو سے انسان کی ہر لغزش کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ لیکن جو شخص انسانوں کی محکومیت اختیار کر کے اپنا مقام ہی کھو بیٹھے، اس کا ازالہ خدا بھی نہیں کرتا۔ اسی لئے شرک کو ظلمِ عظیم کہا گیا ہے۔ (۳۱/۱۳)۔ ظلم کے معنی ہیں۔ جس چیز کو جس مقام پر ہونا چاہیئے اُس کا اس مقام پر نہ ہونا۔ محکومیت کی ان پستیوں میں گر کر انسان کا سینہ جس خوف اور حزن کا نشیمن بنا رہتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قرآنِ کریم نے فرقہ پرستی کو اسی لئے شرک کہا ہے کہ (۳۰/۳۲) اس میں انسان کتاب اللہ کی اطاعت کے بجائے، انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت کرتا ہے۔ فرقہ قائم ہی شخصیت پرستی کی بنیادوں پر ہوتا ہے۔ شخصیتوں کو درمیان سے نکال کر براہِ راست کتاب اللہ کے ساتھ متمسک ہو جایئے، فرقوں کا وجود ختم ہو جائے گا، اسی کو اسلامی نظام کہا جائے گا۔

قرآنِ کریم نے انسان کا سب سے بڑا شرف یہ بتایا ہے کہ اسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ شرک میں انسان، اپنے اختیار و ارادہ کو دوسروں کے سپرد کر دیتا ہے، یا یوں کہیئے کہ مستبد اربابِ اقتدار اس کے اختیار و ارادہ کو سلب کر لیتے ہیں۔ اس طرح وہ شرفِ انسانیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ اس میں جرأت و بے باکی کی صلاحیت مفلوج ہو جاتی ہے، وہ اپنی ذمہ داریوں کا سامنا کرنے سے جی چراتا ہے۔ وہ اپنے فیصلوں اور اقدامات کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے، اپنے آپ کو مجبور قرار دیتا ہے۔ سورۂ نحل میں ہے کہ: وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ..... (۱۶/۳۵)۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے جو غیر اللہ کی محکومیت اختیار کر رکھی ہے، تو اس کے لئے ہم مجبور ہیں۔ یہ سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ چاہتا تو ہم ان کی محکومیت

کبھی اختیار نہ کرتے۔

اس مقام پر پہنچ جاتا ہے انسان شرک سے ـــــ ارباب اقتدار یہ کہہ کر اپنے ظلم و استبداد کے الزام سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اللہ کی مرضی سے کرتے ہیں۔ اسی نے ہمیں یہ اقتدار دیا ہے اور اسی کے حکم سے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ دوسری طرف ان کے مطیع و فرماں پذیر یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں کہ ہم جو ان کی محکومیت اختیار کرتے ہیں تو یہ اللہ کی مرضی ہے۔ ہم اس میں مجبور ہیں۔

عقیدۂ جبر وضع کردہ ہی مستبد انسانی حکومتوں کا ہے۔ انہیں یہ بہت (SUIT) کرتا ہے۔ "ہم ظلم نہیں کرتے۔ خدا کا حکم ہی ایسا ہے" "ہم ظلم نہیں سہتے، خدا کی مرضی ہی ایسی ہے"۔ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ ..... (۲۲/۷۳)۔ حاکم و محکوم دونوں جرأت سے عاری ہیں کہ مردانہ وار اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول کریں۔ ان (نام نہاد) خدا پرستوں سے تو وہ ملحد و بے دین ہزار بار اچھے ہیں جو ظلم و زیادتی کرتے ہیں تو دھڑلے سے کہتے ہیں کہ ہم ایسا کرتے ہیں۔ وہ اپنی چیرہ دستیوں کے لئے خدا کو سپر نہیں بناتے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ استبداد کا نتیجہ خوف و حزن اور مفلسی و محتاجی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے عذاب سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ نحل میں اس کی وضاحت ایک مثال سے کی گئی ہے.....

بھوک اور خوف عذاب ہیں

فرمایا: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ ..... (۱۶/۱۱۲) اللہ ایک ..... بستی کی مثال دیتا ہے۔ اسے امن بھی نصیب تھا اور اطمینان بھی۔ یعنی انہیں نہ خوف تھا نہ حزن۔ ان کی طرف چاروں طرف سے رزق بافراط کھنچے چلا آتا تھا یہ نتیجہ تھا ان کے صحیح نظام کا، فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ ..... انہوں نے اپنے ربوبیت عامہ کے نظام کو بدل ڈالا۔ نعماء خداوندی کی ناشکر گذاری کی۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا امن بھی چھن گیا اور رزق بھی۔ وہ بھوک اور خوف کے عذاب میں ماخوذ ہو گئی۔ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ (۱۶/۱۱۲)۔ یہ نتیجہ تھا ان کے خود ساختہ نظام کا۔

یہ عذاب رفع کس طرح ہوتا ہے؟ حکومتِ خداوندی قائم کرنے سے۔ سورۂ النور میں اس حکومت کے قیام اور اس کے ثمرات کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس سے ان تمام مقامات کی وضاحت ہو جاتی ہے جو سابقہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے ہیں۔ فرمایا:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ..... (۲۴/۵۵)

ہم نے ان لوگوں سے، جو ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں، یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم انہیں اسی دنیا میں

حکومت عطا کریں گے جس طرح ہم نے اپنے اسی اصول کے مطابق اقوامِ سابقہ کو بھی اسی قسم کی حکومت (تمکن) عطا کی تھی۔

آیت کے اتنے حصّے سے جو حقائق سامنے آتے ہیں، سردست انہی کو پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ جہاں جہاں خدا نے کہا ہے کہ ہم نے وعدہ کر رکھا ہے (یا یہ ہمارا وعدہ ہے) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خدا کا قانون ہے جس کا نتیجہ اٹل ہے۔ ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے۔ یہ خدا کا ابدی قانون ہے۔ اسی قانون کے مطابق بنی اسرائیل کو حکومت اور مملکت عطا ہوئی تھی (عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ ..... ۷/۱۲۹) اسی کی رُو سے آلِ ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت کے علاوہ ملکِ عظیم عطا ہوا تھا۔ (۴/۵۴)۔ انہی معنوں میں حضرت داؤدؑ خلیفہ فی الارض (۳۸/۲۶) تھے، اور یہ استخلاف فی الارض اس لئے عطا ہوا تھا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ ..... (۳۸/۲۶) وہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ وحی خداوندی کے مطابق کر سکیں۔

ہمارے دور کے بعض مدعی (غلامی اور محکومی کے انسانیت کُش جراثیم جن کی ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کر چکے ہیں) کہا کرتے ہیں کہ آیت (۲۴/۵۵) میں جس خلافت فی الارض کا وعدہ کیا گیا ہے، وہ "روحانی خلافت" ہے۔ جو انگریز کی غلامی میں بھی حاصل ہو سکتی تھی۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ الدین (اسلام) میں روحانی اور مادی میں ثنویت ہوتی ہی نہیں۔ ہر مادی کام جو قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے کیا جائے، "روحانی" ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ نے اسلام کی اس خصوصیت کو بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ

از کلیسا دیں، جدا دنیا کشاد

وہ (اسلام) دنیا کے ہر دروازے کو دین کی چابی سے کھولتا ہے۔ لہٰذا، مادی حکومت کو چھوڑ کر "روحانی خلافت" کو دین کا مقصود سمجھ لینا فریبِ نفس سے زیادہ کچھ نہیں۔

قرآنِ کریم نے تاریخی شواہد (اقوامِ سابقہ کی مثال) سے خود ہی واضح کر دیا کہ استخلاف فی الارض سے مراد کیا ہے۔ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں تو الفاظ بھی یہی آئے ہیں (۷/۱۲۹) دوسری جگہ ان کی تفسیر ان الفاظ سے کر دی کہ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا ..... (۷/۱۳۷) "ہم نے اس قوم کو جسے فرعون کی چیرہ دستیوں نے کچل کر رکھ دیا تھا، اس ملک کے مشرقی اور مغربی حصّوں کا مالک بنا دیا۔" دوسری جگہ ہے کہ قومِ فرعون کو اس ملک کے باغات، چشموں، خزائن اور بلند و بالا مقامات سے نکال کر بنی اسرائیل کو ان کا مالک بنا دیا۔ (۲۶/۵۷-۵۹) سورۂ قصص میں ہے: وَنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۙ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ .... (۲۸/۵-۶) ہم نے بنی اسرائیل کو ان ممالک کا وارث (مالک) بنا دیا اور اس طرح انہیں وہاں تمکن عطا کر دیا۔ اور یہی الفاظ جماعت مومنین کے متعلق آئے ہیں جن سے (ایمان و اعمالِ صالح کے نتیجے میں) استخلاف فی الارض کا وعدہ کیا تھا۔ فرمایا: وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا

(۳۳/۲۷) خدا نے تمہیں تمہارے مخالفین کی زمینوں کا۔ ان کے شہروں کا۔ ان کے مال و دولت کا مالک بنا دیا۔ اور ان زمینوں کا بھی جن پر تمہارا قبضہ بعد میں ہونے والا تھا۔

ان شواہد سے واضح ہے کہ جس استخلاف فی الارض کو ایمان و عمل صالح کا فطری نتیجہ بتایا گیا ہے اس سے مراد مملکت اور حکومت ہے۔

(۲) یہیں سے ہمارے سامنے یہ حقیقت بھی آ گئی کہ حکومتِ خداوندی یا اسلامی مملکت کسے کہا جائے گا! مملکت اور حکومت تو بزورِ شمشیر ہلاکو اور چنگیز نے بھی حاصل کر لی تھی، اور شاہنشاہوں کے ولی عہد اسے وراثتاً بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ (اسے موروثی ملوکیت کہا جاتا ہے!) کیا اسے بھی خدا کی طرف سے عطا کردہ استخلاف فی الارض کہا جائے گا اور اس کے سربراہوں کو ایسے اربابِ اقتدار جو منشائے خداوندی کو پورا کرنے کے لئے مامور ہوتے ہیں؟ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ!۔

اسلامی حکومت

اگر ایسا ہی ہو تو صاحبِ ضربِ کلیمی کو فرعون کی کلائی مروڑنے کے لئے کیوں بھیجا جائے؟ حکومت وہی منشاءِ خداوندی کے مطابق (یعنی اسلامی) قرار پا سکتی ہے جو ایمان و اعمالِ صالح کی رُو سے قائم کی جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی مملکت ان افراد کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے جو اپنی زندگی اقدارِ خداوندی کے حدود کے اندر رہتے ہوئے گزاریں اور ان کی سیرت و کردار، قرآنی اقدار کے سانچے میں ڈھلی ہو۔ اس مملکت کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس قسم کے افراد تیار کئے جائیں۔ جیسا کہ حضور نبی اکرمؐ نے مکہ کی زندگی میں کیا۔ مدنی مملکت انہی کے ایمان و اعمالِ صالح کا نتیجہ تھی۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ کوئی خطۂ زمین مل جائے جس میں اس قسم کی مملکت قائم کی جا سکتی ہو، تو جب تک اس کی زمامِ اقتدار ایسے افراد کے ہاتھوں میں نہیں آئے گی جو سیرت و کردار کی رُو سے قرآنی معیار پر پورے اتریں اور اس کا کاروبار کتاب اللہ کے مطابق ہو اسے اسلامی مملکت نہیں کہا جائے گا۔ وہ دنیا کی دیگر مملکتوں کی طرح ایک مملکت ہوگی۔ موروثی ملوکیت یا بزورِ شمشیر حاصل کردہ مملکت اسلامی نہیں کہلا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ صدرِ اوّل کے بعد، ہماری تاریخ میں آج تک کسی مملکت کو بھی اسلامی مملکت نہیں کہا جا سکتا۔

(۳) یہ تو رہا یہ سوال کہ ایسی مملکت قائم کس طرح کی جاتی ہے؟ اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ مملکت مقصود بالذات ہوتی ہے یا کسی بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ؟ قرآن کریم اس سوال کا متعین جواب دیتا ہے کہ یہ مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس مقصد کو اس نے یہ کہہ کر واضح کر دیا: وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ..... (۲۴/۵۵) وہ مقصد یہ ہے کہ جس دین کو خدا نے تمہارے لئے متعین (پسند) کیا ہے اسے تمکّن حاصل ہو جائے ـــــ دین کا تمکّن اس مملکت کے قیام کا مقصد، علتِ غائی بلکہ وجہِ جواز ہے۔ اس سے واضح ہے کہ

(۱) اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین کو تمکّن حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور

(۲) جس مملکت میں دین کو تمکّن حاصل نہیں، وہ اسلامی نہیں کہلا سکتی۔

ضمناً۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، نیشنلسٹ علماء کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کی سیکولر حکومت میں بھی اسلام پر عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے مسلمانوں کی الگ آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ اس کے جواب میں، ہم (علاوہ دیگر دلائل و شواہد) اس آیت کو بطور دلیل اور سند پیش کیا کرتے تھے (کہ اپنی مملکت کے بغیر دین کو تمکّن حاصل نہیں ہو سکتا)۔ ان سے ان کا کوئی جواب بن نہیں پڑتا تھا۔ ان کی غلط نگہی یہ تھی کہ وہ اسلام کو ایک مذہب سمجھتے تھے۔ دین نہیں۔

اسی بنا پر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اور یہ قرآنِ کریم کے اس ارشاد کی تشریح تھی جس کی رُو سے اس نے نماز، روزہ کو بھی دین کے تمکّن سے مشروط قرار دیا ہے۔ اس نے جماعتِ مومنین کے متعلق کہا ہے کہ: اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط ..... (۲۲/۴۱)۔ "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں تمکّن حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ۔ ایتائے زکوٰۃ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں گے"..... اسلامی مملکت کے بغیر تو صلوٰۃ اور زکوٰۃ جیسے احکام پر بھی منشائے خداوندی کے مطابق عمل پیرا نہیں ہوا جا سکتا۔ ان کی حیثیت مذہبی رسوم کی سی رہ جاتی ہے۔

لہٰذا، جہاں تک شقِ دوم کا تعلق ہے، اسلامی مملکت کا مقصد دین کا تمکّن ہے۔ مذہب کا نفاذ نہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ جس غلط نگہی نے تحریکِ پاکستان کے دوران دین اور مذہب میں تصادم پیدا کر دیا تھا، وہی غلط نگہی اب پاکستان میں عام ہو رہی ہے۔ یہاں مذہبی احکام نافذ کئے جاتے ہیں اور انہیں اسلامی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہاں مذہب کے اجارہ دار وہی حضرات ہیں جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور جو اسلام کو ایک مذہب سمجھتے تھے۔ وہ یہاں بھی اسے مذہب ہی کی حیثیت سے رائج کرنا چاہتے ہیں کیونکہ مذہبی پیشوائیت کا وجود اسی سے قائم رہ سکتا ہے۔

(۳) اب آگے چلئے۔ مملکت بھی قائم ہو گئی۔ دین کو تمکن بھی حاصل ہو گیا۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ فرمایا کہ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہے:۔

وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا ط ..... (۲۴/۵۵)

تاکہ اُن کا خوف امن سے بدل جائے۔

آپ نے غور فرمایا کہ حکومتِ خداوندی کے قیام اور دین کے تمکن کا حاصل کیا ہے؟ یہ کہ کسی کو کسی قسم کا خوف نہ ہو۔ اس سے ہمارے سامنے ایک ابدی کسوٹی آ گئی جس پر پرکھ کر دیکھا جا سکتا ہے کہ کوئی

مملکت اسلامی ہے یا نہیں۔ اگر وہ مملکت ایسی ہے جس میں کسی کو کسی قسم کا خوف نہیں تو وہ اسلامی ہے۔ اگر افراد مملکت خوف و حزن کا شکار ہیں تو مملکت غیر اسلامی ہے اور اس کی حکومت فرعونی۔

(۴) اگلا سوال یہ سامنے آیا کہ امن کی یہ کیفیت پیدا کس طرح ہوتی ہے؛ اس کا جواب وہی ہے جس سے ہم نے آغازِ کلام کیا ہے؛ یعنی یہ کہ

يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ...... (۲۴/۵۵)

اس مملکت میں حکومت صرف خدا (کی کتاب) کی ہوگی۔ اس کے ساتھ کچھ نہیں ملایا جائے گا کیونکہ ایسا کرنا شرک ہے۔

بات سمٹ سمٹا کر وہیں آ گئی کہ خوف اسی صورت میں مٹ سکتا ہے کہ حکمران صرف کتاب اللہ کی ہو۔ اگر کتاب اللہ کے ساتھ کچھ اور ملا دیا، تو یہ شرک ہوگا اور اس کا نتیجہ خوف۔ جو کچھ کتاب اللہ کے ساتھ ملایا جائے گا وہ لامحالہ انسانوں کا وضع کردہ ہوگا، خواہ وہ انسان سامنے موجود ہوں، اور خواہ کسی سابقہ زمانے میں گذر چکے ہوں۔ اسلام کے منشور لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ (کوئی صاحبِ اقتدار نہیں سوائے اللہ کے) میں اربابِ سیاست بھی آ جاتے ہیں اور اعیانِ مذہب بھی..... خواہ وہ دورِ حاضر سے متعلق ہوں اور خواہ ماضی کے دور سے۔ یہ سب آلہٰ غیر اللہ ہیں جن کی اطاعت شرک ہے۔

اس مقام پر مجھے ایک ذاتی واقعہ یاد آ گیا جسے میں نے شاید پہلے بھی کبھی بیان کیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں دہلی میں پہلے پہل ریڈیو نصب ہوا تو انہیں عید الاضحیٰ کی تقریب پر تقریر نشر کرنے کے لئے کسی موزوں مقرر کی تلاش ہوئی۔ اسلامی حلقے میں میری کافی شہرت تھی لہٰذا انہوں نے اس مقصد کے لئے میرا نام تجویز کیا۔ لیکن میں سرکاری ملازمت سے منسلک تھا، اس لئے سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا سرکاری ملازمین کو ریڈیائی تقریریں نشر کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ یہ سوال اصولی طور پر ہوم ڈیپارٹمنٹ میں بھیجا گیا جس سے میں خود منسلک تھا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ تم جس موضوع پر تقریر کرنا چاہتے ہو، اس کا ملخص کیا ہے؛ میں نے کہا کہ یہ قربانی کی عید کی تقریب ہے۔ میں حضرت ابراہیمؑ کا اسوۂ حسنہ پیش کروں گا اور بتاؤں گا کہ انہوں نے شرک کی کس قدر مخالفت کی تھی۔ چونکہ یہ سوال اصولی تھا اور پہلے پہل زیرِ غور آیا تھا اس لئے بات بڑھتے بڑھتے سیکرٹری تک پہنچی۔ وہ (انگریز) سیکرٹری علومِ مشرقی میں بھی کافی درک رکھتا تھا۔ اس نے مجھے بلایا تو میں نے کہا کہ یہ ایک مذہبی تقریب ہے اور شرک جیسا مسئلہ میرا موضوع ہے اس لئے میری تقریر میں کونسی بات قابلِ اعتراض ہو سکتی ہے؛ یہ سن کر وہ مسکرایا اور مجھ سے کہا کہ کیا قرآن کی رو سے شرک کا یہ مفہوم نہیں کہ حکومت صرف خدا کی ہو سکتی ہے اور اس کے حقِ حکومت میں کوئی انسان شریک نہیں ہو سکتا!—— میں اس کی زبان سے یہ سن کر ورطۂ حیرت میں گم ہو گیا۔ پھر سنبھل کر کہا کہ قرآنِ مجید کی رو سے حقیقت تو یہی ہے —— اس پر اس نے کہا کہ پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمہاری تقریر کو

سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ سیاست تو ایک طرف، یہ نظریہ تو ہر حکومت کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ (ضمناً۔ اس کے باوجود اس نے مجھے یہ کہہ کر تقریر کرنے کی اجازت دے دی کہ ریڈیو والے تمہاری تقریر کا خود جائزہ لے لیں گے)۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآنِ مجید کی رُو سے شرک کا مفہوم کیا ہے؟ ان تصریحات کی روشنی میں، سورۃ النور کی مذکورہ صدر آیۂ جلیلہ کا ملخص یہ ہے کہ:

(۱) اسلامی مملکت ایمان و اعمالِ صالح کے نتیجہ میں ملتی ہے۔

(۲) اس مملکت کا مقصد، دین کا تمکّن ہے۔

(۳) دین کے تمکّن کے معنی یہ ہیں کہ محکومیت صرف اللہ (کی کتاب) کی اختیار کی جائے۔

(۴) اگر کتاب اللہ کے ساتھ کچھ اور ملا دیا جائے تو وہ انسانی حکومت ہو جائے گی جو شرک ہے۔

اور (۵) شرک کا نتیجہ خوف ہے۔

پہلے کہا جا چکا ہے کہ خوف اور بھوک خُدا کا عذاب ہے۔ سورۃ القریش میں مخالفین کو جو ربِ کعبہ کی محکومیت اختیار کرنے کے لئے کہا گیا ہے تو اس ربّ کی خصوصیاتِ کبریٰ یہ بتائی گئی ہیں کہ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ..... (۱۰۶/۴) "وہ بھوک اور خوف کے عذاب سے نجات دلاتا ہے"۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ: وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ۝ (۲۰/۱۱۲) "جو شخص (یا قوم) ضابطۂ قوانینِ خداوندی کی صداقت کو تسلیم کر کے خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے گا، اسے نہ کسی ظالم کے ظلم کا خوف ہوگا، نہ کسی حق تلفی کرنے والے کے سلب و نہب کا اندیشہ۔ وہ انسانی استیلا و استبداد اور جور و استحصال (EXPLOITATION) سے مامون رہے گا۔ نہ کوئی اس پر ظلم و زیادتی کر سکے گا، نہ ہی اس کی محنت کے ماحصل کو چھین جھپٹ کر لے جا سکے گا۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

سورۃ النور کی زیرِ نظر آیت کے آخری الفاظ ہیں: وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۲۴/۵۵)۔ جو قوم اس قسم کا نظام قائم کرنے کے بعد، اس سے برگشتہ ہو جائے گی، تو وہ ان تمام برکات سے محروم ہو جائے گی۔

قبل اس کے کہ ہم اِس حریماں نصیب قوم کی طرف تعزیت کے لئے جائیں، ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ہم نے بتایا ہے کہ خوف اُمّ الخبائث ہے۔ یعنی تمام برائیوں کی جڑ۔ اور قرآنی تعلیم و نظام کا مقصود اس مرض سے نجات دلانا ہے۔ لیکن قرآنِ مجید میں خدا کے خوف کا بار بار ذکر آتا ہے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟

خدا کا خوف

خوف کے معنی کسی آنے والے خطرہ، یا کسی غلط کام کے مضرت رساں نتیجہ کے احساس کے بھی ہیں۔ مثلاً یہ ڈر کہ اگر میں نے آگ میں ہاتھ ڈال دیا تو اس سے میرا ہاتھ جل جائے گا اور اس سے بڑی اذیّت ہوگی اس لئے مجھے آگ کے قریب نہیں جانا چاہیئے۔ اس خوف کے معنی ہوں گے کسی

آنے والے خطرہ کے احساس سے ان اسباب کا سدباب کرنا جن سے اس خطرہ کے پیدا ہونے کا امکان ہو۔ قرآن میں مومنین کے متعلق کہا ہے یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَ یَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا (۷۶/۷) وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں کیونکہ انہیں اس کا "خوف" رہتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو معاشرہ ایسی شکل اختیار کرلے گا جس میں چاروں طرف شر پھیل جائے گا۔ (اگلی آیت میں کہا گیا ہے کہ وہ اس عالمگیر فساد کو روکنے کے لئے خدا کے نظام ربوبیت کو عام کر دیتے ہیں تاکہ نہ کوئی بھوکا رہے اور نہ وہ معاشرہ میں فساد پھیلانے کے لئے اٹھ کھڑا ہو)

لہٰذا، خدا سے ڈرنے کے معنی ہیں، قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے مضرت رساں نتیجہ کے احساس سے، اس سے محتاط رہنے کا جذبہ۔ اس "خوف" کے متعلق تو خود حضور نبی اکرمؐ کی لسان مبارک سے کہلایا گیا کہ قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۶/۱۵)۔ "خدا کا قانون مکافات عمل اس قدر ہمہ گیر ہے کہ (اور تو اور) اگر (بالفرض محال) میں بھی اس کی خلاف ورزی کروں تو ڈرتا ہوں کہ میں بھی اس کے مضرت رساں نتیجہ سے بچ نہیں سکوں گا۔"

یہ ہے خدا کے خوف کا مفہوم۔ اس احساس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان (فرد مومن) اس کے قوانین کی خلاف ورزی سے محتاط رہے گا۔ یہ احتیاط اسے ہر قسم کے خوف سے مامون کر دے گی۔ (اس احساس کو تقوٰی کہتے ہیں) اسی لئے کہا کہ فَمَنِ اتَّقٰی وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ (۷/۳۵) جو احتیاط برتے گا اور اس طرح اپنی اصلاح کر لے گا تو اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔ اقبالؒ نے اس "خوف" اور انسانوں کی طرف سے مسلط کئے جانے والے خوف کے فرق کو بڑے عمیق انداز سے واضح کیا ہے جب کہا ہے کہ

یک غم است آں غم کہ آدم را خورد ... آں غم دیگر کہ ہر غم را خورد (زبور عجم ص ۲۵۲)

ایک غم وہ ہے جو انسان کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھا جاتا ہے۔ اور ایک غم وہ ہے جو دنیا کے ہر غم سے نجات دلا دیتا ہے۔ حفیظ ہوشیار پوری (مرحوم) نے اسے باندازِ تغزل بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ کہا ہے:

زمانے بھر کے غم، یا اک ترا غم ... یہ غم ہوگا تو کوئی غم نہ ہوگا

سزا کا خوف

اتنا اور واضح کر دیا جائے کہ قرآنی نظام مملکت میں بھی مجرموں کو سزا کا خوف ہوگا۔ قرآن کی رو سے "جرم و سزا" کے موضوع پر میں الگ لکھ چکا ہوں اس لئے اس مقام پر اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ (ملاحظہ ہو طلوع اسلام۔ بابت جون ۱۹۷۷ء)۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ:

۱۔ جب قرآنی نظام میں ہر شخص خوف اور حزن سے مامون ہوگا، اور کسی کی کوئی ضرورت رکی نہیں رہے گی تو ارتکاب جرم کے نناوے فی صد محرکات اسی سے ختم ہو جائیں گے۔

۲۔ قرآن کریم اپنے ہر قانون کی علت بیان کر دیتا ہے۔ یعنی وہ سمجھا دیتا ہے کہ ایسا قانون کیوں بنایا گیا ہے۔

لہ خدا نے اپنی طرف حزن کا لفظ کہیں منسوب نہیں کیا۔ ہر جگہ خوف ہی کہا ہے۔ اور (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) اس خوف کے معنی ہیں قوانین خداوندی کی خلاف ورزی سے بچنے کی احتیاط۔ ظاہر ہے کہ احتیاط سے حزن پیدا نہیں ہوتا۔

اس کی پیروی کرنے سے کیا مفادات حاصل ہوں گے اور اس کی خلاف ورزی سے کس قسم کے مضرات جنم لیں گے۔ جب کسی قانون کو اس طرح سمجھ لیا جائے تو اس سے ذہن مطمئن ہو جاتا ہے اور یہ اطمینان بھی بڑی حد تک انسداد جرائم میں مانع ہوتا ہے۔

۳۔ اس نظام میں کسی کو اس کا دھڑکا نہیں لگا رہتا کہ معلوم کل کو کس قسم کا قانون نافذ ہو جائے۔ یا اگر موجودہ حکومت کی جگہ دوسری حکومت برسر اقتدار آ جائے تو پتہ نہیں وہ کس قسم کا الٹ پلٹ کر دے۔ قرآن نے جو اپنے اصول و حدود کو غیر متبدل قرار دیا ہے تو اس سے اسی قسم کا اطمینان پیدا کرنا مقصود ہے۔ ہر شخص ان اصول و اقدار کو سمجھ سوچ کر اختیار کرے گا اور پھر مطمئن رہے گا کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔

۴۔ اس نظام میں یہ بھی نہیں ہو گا کہ کسی مضرت رساں قانون کو کسی سابقہ تاریخ سے نافذ کر دیا جائے۔ ایسا کرنے سے افراد معاشرہ کے دلوں میں عدم اطمینان کا جو مستقل اضطراب موجزن رہتا ہے، ظاہر ہے۔

۵۔ اس قدر احتیاط کے باوجود اگر معاشرہ میں ایسے افراد موجود ہیں جو جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں، تو انہیں آپ مزمن امراض کے مریض سمجھ لیجئے۔ بایں ہمہ، معاشرہ کو ان کی دراز دستیوں (یا پاگل پن) سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ انہیں اس سے روکا جائے۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآنی نظام کی جو بنیادی خصوصیت ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (اس میں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہو گا) تو اس قسم کی فضا کو قائم رکھنے کے لئے، مجرمین کے خلاف تعزیری اقدامات لابدی ہو جاتے ہیں۔ معاشرہ کے کلی امن کے لئے اس قسم کا استثنائی خوف ناگزیر ہوتا ہے۔

۶۔ قرآن کریم اس قسم کے مجرمین کو درحقیقت نفسیاتی مریض تصور کرتا ہے۔ سزا کا خوف بھی نفسیاتی امراض کا علاج ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو اس نے کہا ہے کہ اگر مجرم میں احساس ندامت ہو، وہ اپنے کئے پر پچھتائے، اور اس میں اصلاح کا امکان ہو، تو اسے معاف کر دیا جائے۔ (قرآن نے ہر جرم میں معافی کی گنجائش رکھی ہے) سزا اسے ہی دی جائے گی جس کا مرض لاعلاج ہو اور معاشرہ کے امن کو برقرار رکھنے کے لئے اس کے سوا چارہ نہ ہو۔

صدر اوّل کے بعد

اب ہم اس آیت (۵/۴۴) کے آخری حصہ کی طرف آتے ہیں وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ۔ اس نظام کے قائم ہو جانے کے بعد، جو لوگ اس سے منحرف ہو جائیں گے تو ان کا حشر فاسقوں جیسا ہو گا۔ قرآن کریم میں فاسقین کے متعلق بڑی تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ ہم اس میں سے صرف دو نکات کو سامنے لاتے ہیں۔ ایک یہ کہ۔ أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ۔ (۳۲/۱۸)۔ مومن اور فاسق ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ اس سے واضح ہے کہ مومن اور فاسق ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔

دوسری آیت یہ کہ فاسق کہتے کسے ہیں۔ فرمایا

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ (۵/۴۷)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہی کو فاسق کہتے ہیں۔

صدر اوّل میں (آیت ۵/۴۵) کے مطابق جو حکومت قائم ہوئی تھی وہ مومنین کی حکومت تھی جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی تھی۔ اس نہج حکومت میں، انسانوں کے ہاتھوں سے اقتدار چھن گیا۔ نہ ملوکیت (بادشاہت یا آمریت) باقی رہی، نہ مذہبی پیشوائیت۔

نقش قرآن تا دریں عالم نشست — نقشہائے کاہن و پاپا شکست (جاوید نامہ صفحہ ۹)

قرآنی نظام کے متمکن ہو جانے کا نتیجہ تھا کہ مذہبی پیشوائیت کے نقوش تک مٹ گئے۔

اس کے بعد اس قوم نے کیا کیا؟

خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست — خود سر تختِ ملوکیت نشست

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقش از ملوکیت گرفت

از ملوکیت نگہ گردد دگر

عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر (جاوید نامہ صفحہ ۸۷)

آسمان کی آنکھ نے اس قسم کا تماشا بہت کم دیکھا ہوگا کہ جس قوم نے قیصر و کسریٰ کے تختوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے، اسی قوم نے ان ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے اکٹھا کیا۔ جوڑا، شاہنشاہیت کے تخت بنائے اور خود ان پر براجمان ہوگئی۔ قوم مذہب پرست تھی ان شاہنشاہوں نے نظامِ ملوکیت کو مستحکم کرنے کے لئے مذہب ہی کو آلہ بنایا دین نے تو ملوکیت کی جڑ کاٹ دی تھی۔ انہوں نے دین کو مذہب سے بدل دیا۔ یہ فریضہ مذہبی پیشوائیت نے سرانجام دیا۔ انہوں نے قرآن کی اصطلاحات کو تو علیٰ حالہٖ رہنے دیا۔ اس کے مفہوم کو بدل دیا۔

اقبالؒ کے الفاظ میں۔

خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

انہوں نے قرآن کو بدلنے کے لئے جو حربے استعمال کئے وہ ایسے لطیف اور غیر محسوس تھے کہ عوام کی نگاہیں انہیں بھانپ نہیں سکتی تھیں۔ (مثلاً) دین میں الٰہ کے معنی تھے صاحبِ اقتدار، حاکم۔ اس لئے لا الٰہ الا اللہ کے معنی تھے، کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں۔ حکومت صرف خدا کی جائز ہے —— حکمران ہے اک وہی باقی بتانِ آذری۔ انہوں نے الٰہ کے معنی کر دیئے ”وہ جس کی پرستش کی جائے“۔ ان معانی کی رو سے لا الٰہ الا اللہ کے معنی ہو گئے۔ پرستش صرف خدا کی جائز ہے۔ اور کسی کی نہیں۔ اس طرح خدا کو مقام حاکمیت سے اتار کر پرستش گاہوں کے محراب میں بٹھایا اور تختِ حکومت، سلاطین نے بلا غل و غش سنبھال لئے۔ عبادت کے معنی محکومیت کے بجائے، پرستش اور بندگی کر لئے اور مومن کے نعرۂ انقلاب آفریں اِيَّاكَ نَعْبُدُ (ہم صرف تیری حاکمیت تسلیم کرتے ہیں۔ اور کسی کی نہیں) کے معنی ہو گئے۔ ہم صرف تیری پرستش کرتے ہیں۔ یعنی پرستش خدا کی اور حکومت بادشاہوں کی۔ ان بادشاہوں کے متعلق کہہ دیا۔ السلطان ظل اللہ علی الارض۔ ”بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے“ اور ان کے ہر حکم کو فرمانِ خداوندی کا درجہ دے دیا۔ یہ عقیدہ وضع کر دیا کہ انہیں خدا ہی نے ملک اور حکومت عطا کئے ہیں اس لئے وہ جو کچھ کرتے ہیں خدا کی مرضی سے کرتے ہیں۔

شخصی حکومتوں میں معاشرہ پر جس قدر خوف طاری رہتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس خوف سے (اقبالؒ کے الفاظ میں) ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں اور افرادِ معاشرہ کا قلب و دماغ شل ہو کر رہ جاتا ہے ان کی نہ آنکھیں اپنی رہتی ہیں نہ کان۔ نہ دل اپنا رہتا ہے نہ دماغ۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ وہ مقام انسانیت سے گر کر حیوانی سطح پر آجاتے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ پست سطح پر۔

اس قسم کے مذہب کو مستحکم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ اربابِ مذہب کی مستقل تائید و اعانت حاصل رہے۔ اس کے لئے انہوں نے مذہبی پیشوائیت سے سمجھوتا کر لیا کہ امورِ حکومت ملوکیت کے اقتدار میں رہیں گے اور امورِ شریعت سے متعلق مذہبی پیشواؤں کے احکام نافذ ہوں گے، حکمرانوں کے کسی فیصلہ کی خلاف ورزی سے خوف پیدا ہوتا تھا تو اربابِ شریعت کے فتویٰ سے اعراض برتنے سے خوف اور حزن دونوں۔ جب کوئی اقلیم شریعت کا حکمران کہدے کہ تمہارے لباس کی تراش خراش غیر شرعی ہے اس لئے تمہیں عذابِ قبر بھی ہوگا اور عذابِ جہنم بھی۔ تو اس سے آپ کا قلب جس حزن و ملال کی آماجگاہ بن سکتا ہے، ظاہر ہے۔ آگے بڑھئے۔ اگر کسی نے غصہ میں آکر اپنی بیوی سے کہدیا۔ طلاق۔ طلاق۔ طلاق۔ لیکن جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو اسے ان الفاظ پر سخت ندامت ہوئی۔ لیکن بارگاہِ شریعت سے فتویٰ صادر ہو گیا کہ تمہاری بیوی تم پر حرام ہو گئی ہے۔ وہ پھر سے تمہاری بیوی اسی صورت میں بن سکتی ہے کہ ایک رات کسی غیر مرد سے ہم بستر ہو۔ اس حکم سے اس مظلوم بے قصور، بڑھیا کے دل پر جو گزر سکتی ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، اس کے حزن کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اگر انہوں نے کسی کے متعلق کہدیا کہ تمہارے عقائد اسلام کے مطابق نہیں رہے تو وہ مرتد قرار پا گیا۔ اور یہ شاید آپ کو معلوم ہی ہو کہ ان کی مملکت میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ جس طرح آج کل ٹریفک پولیس کی دست برد سے بچنے کے لئے "فوٹو۔ پلا" اپنے جیب میں رکھتے ہیں، ہمارے دورِ ملوکیت میں، لوگ ان حضرات کا سارٹیفکیٹ اپنے جیب میں رکھتے تھے کہ اس کے عقائد مطابق اسلام ہیں۔ یہ ہوتا ہے خوف کا عالم انسانی حکومتوں کے دور میں۔

حکومت اور شریعت کی مملکتیں تو پھر بھی محسوس تھیں۔ ان کے علاوہ ایک اور مملکت وجود میں آئی جس کا عالم محسوسات میں پتہ نشان تک نہیں تھا، لیکن ان کی گرفت ان دونوں سے کہیں زیادہ شدید اور محکم تھی۔

"یا حضرت! میں تباہ ہو جاؤں گا۔ برباد ہو جاؤں گا۔ میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ میرا تندرانہ مسترد نہ فرمایئے مجھے اپنے در کے کتوں کے زمرے سے خارج نہ کیجئے۔"

یہ تو پھر بھی زندہ حضرت صاحب کی سوءِ مزاج کا خوف ہے۔ حالت یہ ہے کہ اگر کسی مزار کی طرف (بھولے سے) پشت ہو گئی ہے، تو رو رہے ہیں۔ گڑگڑا رہے ہیں کہ معلوم اب کیا غضب نازل ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ اگر اپنے کمرے کی تنہائیوں میں بیٹھے، حضرت صاحب، کے کسی نقشِ قدم کے متعلق سوءِ ظن کا شائبہ بھی دل میں گزر گیا ہے، تو رات بھر سو نہیں سکتے، اور اس اضطراب سے نجات نہیں مل سکتی جب تک ان کی بارگاہِ معلّٰی میں حاضر ہو کر اس گناہِ عظیم کا کفارہ ادا کر دیا جائے۔

بادشاہوں کی حکومت جسموں پر ہوتی ہے۔ ان اربابِ اقلیم روحانیت کی دلوں پر۔ ملوکیت کا اس میں بھی مفاد ہوتا ہے کہ ان حضرات کی روحانی سلطنت قائم و دائم رہے کیونکہ قوم جس قدر خوف اور حزن کی برفانی سلوں کے نیچے

دبی رہے گی، اس پر حکومت کرنا اتنا ہی آسان ہوگا۔ اسی لئے بڑے بڑے شاہنشاہ ان کی درگاہوں پر نذرانے لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ ارباب اقتدار ان کے عرسوں میں حاضری دیتے، اور ان تمام رسوم میں بصد عقیدت شریک ہوتے ہیں جو جہالت کی تخلیق ہوتی ہیں۔ یہ ان میں اس لئے شرکت کرتے ہیں کہ ایک طرف عوام کے دلوں میں ان مزاروں اور مزاروں میں دفن شدگان کے پاسبانوں کی عقیدت اور بھی زیادہ ہو جائے، اور دوسری طرف یہ خود بھی عوام کی نظروں میں عزیز تر ہو جائیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ ایک ملوکیت (شخصی حکومت) سے خوف اور حزن کے کتنے ہی پھاٹک کھل گئے؟ اقبالؒ نے ان تفصیلات کو ایک شعر میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جب کہا کہ

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت حریت را زہر اندر کام ریخت (اسرار و رموز ۲۴)

جب حکومت سے قرآن کا رشتہ منقطع ہو گیا تو آزادی و حریت کا گلا گھٹ گیا۔ ملت کی رگِ حیات میں زہر سرایت کر گیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ نتیجہ کہ دنیا نے یہ عبرت انگیز نظارہ دیکھا کہ

مومن و پیشِ کساں بستن نطاق مومن و غداری و فقر و نفاق

مومن! اور حالت یہ کہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی کا پٹہ گلے میں ڈالے ہوئے؛ مومن! اور اس کی اخلاقی پستی کا یہ عالم کہ غداری۔ محتاجی اور منافقت اس کے معمولِ زندگی بن گئے! (استغفر اللہ)۔

با پشیزے دین و ملت را فروخت ہم متاعِ خانہ و ہم خانہ سوخت

دین اور ملت کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دینے والا۔ گھر کا سامان ہی نہیں، خود اپنے گھر کو پھونک ڈالنے والا۔

لا الٰہ اندر نمازش بود، و نیست نازہا اندر نیازش بود و نیست

جب یہ مومن تھا تو اس کی نماز اس کے اس ایمان کی شہادت دیتی تھی کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ وہ سجدے میں سر جھکاتا تھا تو عرش کی بلندیاں اس کی پیشانی میں جھکتی نظر آتی تھیں۔

نور در صوم و صلوٰۃِ او نماند جلوۂ در کائناتِ او نماند

اس کی نماز اور روزوں میں کبھی نور کی شمعیں جگمگاتی تھیں۔ اب وہ گل ہو گئیں۔ اس کی دنیا میں روشنی کا نام تک نہ رہا۔

روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام فرد ناہموار و ملت بے نظام

جب اس کی نماز اور روزوں کی روح گم ہو گئی اور وہ رسوم بن کر رہ گئے، تو فرد کی سیرت میں اعتدال باقی نہ رہا اور قوم کا نظام ختم ہو گیا۔ فرد کی ذات میں انتشار پیدا ہو گیا اور قوم کی اجتماعیت میں تفرقہ۔

سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی از چنیں مرداں چہ امید بہی!

اس کے سینے میں قرآن نے جو حرارت پیدا کی تھی جس سے اس کی رگِ حیات میں خونِ زندگی برقِ تاب تھا، وہ حرارت باقی نہ رہی۔ سوچئے کہ ایسے افراد سے بہتری کی کوئی امید بھی وابستہ کی جا سکتی ہے؟

قرآن کی مرکزیت کے باقی نہ رہنے سے ان کے تفرقہ اور اختلاف کی یہ حالت ہے کہ

ہر کسے بر جادۂ خود تند رو ناقۂ ما بے زمام و ہرزہ دو

ہر فرقہ اپنے اپنے طریق پر بھاگے چلا جا رہا ہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ ہم اسلام کے صراطِ مستقیم پر

گامزن ہیں۔ قوم کیا ہے؟ ایک شتر بے مہار ہے کہ جس طرف اس کا جی چاہے منہ اٹھا کر چل دے! فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ۔ (۲۶/۲۲۵)

اسی حقیقت کو وہ ارمغانِ حجاز میں بڑے درد و کرب سے بیان کرتے ہیں کہ

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے — کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک؟
کس طرح ہوا کُند ترا نشترِ تحقیق — ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟ — کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تری رگوں میں — نے گرمیٔ افکار نہ اندیشۂ بے باک

آخر میں ان تمام سوالوں کا ایک جواب یوں دیتے ہیں کہ

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری (ص ۲۴۷)

شخصی حکومتوں کی زنجیروں، انسانوں کی وضع کردہ شریعت کی جکڑبندیوں اور طریقت کی توہم پرستیوں نے قوم کی جرأت و بسالت کی انسانیت ساز صلاحیتوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے، اور ہر سینہ خوف و ہراس کا نشیمن بن کر رہ گیا ہے — نے گرمیٔ افکار نہ اندیشۂ بیباک۔ آپ غور کیجئے کہ دنیا میں قریب ایک ارب مسلمان نام رکھنے والے افراد کی حالت کیا ہے؟ قرآن نے انہیں امتِ واحدہ بنایا تھا۔ یہ نسل اور وطن کی بت پرستی سے بلیسیوں اقوام میں بٹ چکی ہے جن میں کی ہر قوم دوسری قوم سے لرزاں و ترساں ہے، اور تمام اقوام کسی نہ کسی سپر پاور کی محتاج، فلہٰذا اس سے خائف۔ پھر ایک قوم کے اندر افراد کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے محکوم ہیں جن کے استبداد کی تلوار ہر وقت ان کے سر پر لٹکتی رہتی ہے۔ اس طرح وہ خوف اور حزن کے اس جہنم میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں جس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں۔ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ۔

سوال پھر یہی سامنے آتا ہے کہ ہماری یہ حالت کیوں ہو گئی؟ اس کا جواب ہم سے نہیں۔ اس ذاتِ اقدس و اعظم کی لسانِ مبارک سے سنیئے جس کی رسالت نے ہمیں خاک کی پستیوں سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ قرآن کریم نے اسے بڑے جامع محاکاتی انداز میں بیان کیا ہے۔ حشر کا میدان ہے تمام اقوامِ سابقہ ایک ایک کر کے اپنے اپنے رسول کے زیرِ شہادت بارگاہِ خداوندی کے سامنے سے گزر رہی ہیں۔ جب ہماری باری آتی ہے تو حضور نبی اکرمؐ بصد آہ و سوز ناک یہ اعلان فرماتے ہیں کہ

یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰)۔

اے میرے رب! یہ میری وہ قوم ہے جس نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

غور فرمایئے! حضورؐ یہ نہیں فرماتے کہ اس قوم نے روایات کو چھوڑ دیا تھا۔ فقہ کو چھوڑ دیا تھا۔ مسلکِ خانقاہی کو چھوڑ دیا تھا۔ حضورؐ ایک ہی چیز کا نام لیتے ہیں۔ اور وہ ہے قرآن۔ یعنی اس قوم کی یہ حالت اس لئے ہوئی تھی کہ اس نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

قرآن کو اپنی زندگی کا مرکز اور محیط قرار دیا تھا تو لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) کے مقامِ بلند پر فائز ہو گئی تھی۔ یہی مقامِ مومن تھا۔ اسی کا نام اسلامی مملکت تھا۔ یعنی خالص کتاب اللہ کی حکمرانی۔ اسے چھوڑا تو حالت یہ ہو گئی کہ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (۶۳/۴) کہیں کوئی پتہ کھڑکا اور یہ لرز اٹھے کہ آئی کوئی نئی مصیبت! اس خوفِ پیہم اور حزنِ مسلسل میں یہ قوم زندگی بسر کر رہی ہے۔ اور طرفہ تماشا یہ کہ یہ قوم (یا مسلمان نام رکھانے والی اقوام) اس خوش فہمی (فریبِ نفس) میں مبتلا ہیں، یا وہ اپنے عوام کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں کہ ان کے ہاں اسلام کا احیاء، بلکہ فروغ ہو رہا ہے۔ ہمارے دور میں، اسلام کو سب سے زیادہ نقصان اس فریب خوردگی یا فریب دہی سے پہنچا ہے غیر مسلم اقوام ان کی اس خوش فہمی کو پختہ تر کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کرتی ہیں تاکہ ـــــ ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں (ارمغانِ حجاز)۔ مسلمان مملکتیں خوش ہیں کہ عوام کی نگاہ قرآنی نظام کی طرف اٹھنے نہیں پائے گی تو ان کے اقتدار کو کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوگا۔ اور غیر مسلم اقوام مطمئن ہیں کہ اس طرح وہ نظام قائم ہی نہیں ہو سکے گا جس کے متعلق خدا نے کہا تھا لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (۹/۳۳) "وہ تمام نظامہائے عالم پر غالب آجائے گا"۔

اور ظاہر ہے کہ جب (اعلانِ رسالتمآبؐ کے مطابق) ہماری یہ حالت قرآن ترک کر دینے سے ہوئی ہے تو اس کا علاج قرآن کی حکمرانی کے سوا کچھ نہیں۔ اقبالؒ نے اسی لئے کہا تھا کہ

برخور از قرآن اگر خواہی ثبات — در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
می دہد ما را پیام لَا تَخَفْ — می رساند بر مقام لَا تَحْزَنْ (مثنوی ص۴۳)

اگر تم ثبات چاہتے ہو تو قرآن کی حکمرانی قائم کرو۔ اسی میں رازِ دوامِ حیات پوشیدہ ہے۔ اسی سے تم اس مقام پر پہنچ سکتے ہو جہاں نہ کسی کا خوف ہوگا۔ نہ حزن۔ میں اسے پھر دھراؤں کہ (قرآن کی رو سے) کسی مملکت کے اسلامی ہونے کا اوّلیں معیار یہ ہے کہ اس میں افرادِ معاشرہ کو نہ کسی قسم کا خوف ہو۔ نہ حزن۔ اس لئے کہ اس میں کیفیت یہ ہوگی کہ

کس در اینجا سائل و محروم نیست — عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اس میں نہ کوئی روٹی کے لئے کسی کا محتاج ہوگا۔ نہ اس میں کوئی حاکم ہوگا نہ محکوم۔ نہ آقا ہوگا نہ غلام۔ جب کیفیت یہ ہوگی تو خوف و حزن کہاں سے آسکے گا؟ کوئی مملکت محض آئین و دستور اور قوانین و ضوابط کے "شرعی" ہونے سے اسلامی نہیں بن سکتی۔ وہ معاشرہ میں اس قسم کی فضا پیدا کرنے سے اسلامی بن سکتی ہے۔ جس مملکت میں قرآن کی حکمرانی نہیں ہوگی اس میں خوف و حزن ہوگا، اور جس مملکت میں خوف و حزن ہوگا اس کا اسلامی ہونے کا ہر دعویٰ باطل ہوگا۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔ والسلام

۹ نومبر۔ یومِ پیدائش علامہ اقبالؒ

پرویز

نویدِ جانفزا

مطالب الفرقان کی پانچویں جلد بھی شائع ہو گئی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ!

اس میں سورۃ الانعام مکمل، اور سورۃ الاعراف کی آیات (۱-تا-۱۵۸) آگئی ہیں جو بیشتر مشتمل ہیں حضرات انبیاءؑ سابقہ کے کوائفِ حیات اور اقوامِ گذشتہ کی داستانوں پر۔ جو احباب سلسلۂ "مطالب الفرقان" کا مطالعہ کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ تصریفِ آیات کے اصول کے مطابق جس طرح قرآنِ مجید کی تفسیر ان مجلدات میں پیش کی جارہی ہے اس سے قرآنی حقائق کس طرح نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

> یہ جلد اعلیٰ درجے کے سفید کاغذ کے (۶۰۴) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتابت، طباعت، جلد، سابقہ جلدوں کے معیار کے مطابق، عمدہ اور دل کش ہے۔
> قیمت فی جلد ۵۷/- روپے۔ محصول ڈاک: چھ (6/-) روپے

ملنے کا پتہ

(۱)۔ ادارۂ طلوعِ اسلام — ۲۵/بی — گلبرگ ۲ لاہور

(۲)۔ مکتبۂ دین و دانش — چوک اردو بازار — لاہور

بابُ المراسلات

۱- پاکستان کا پہلا "کمیونسٹ"

سوال: سُنا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد آپ کو "سرکاری طور پر" کمیونسٹ قرار دیا گیا تھا۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ آپ کی تو ساری عمر کمیونزم کی مخالفت میں گزری ہے۔ آپ کا یہ قول بار بار ہمارے کانوں میں گونجتا ہے کہ نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے، نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان۔ پھر آپ کے متعلق یہ کیسے کہا گیا؟

پرویز

آپ نے یہ سوال پوچھ کر میری عمرِ رفتہ کو بہت دُور سے آواز دی ہے۔ واقعہ تو مجھے یاد ہے لیکن مرورِ زمانہ کی وجہ سے اس کی جزئیات کو مستحضر کرنے کے لئے مجھے ذہن پر زور دینا پڑے گا کیونکہ وہ دھندلا چکی ہیں۔

بات یوں ہوئی کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد مرکزی حکومت نے ایک کمیشن مقرر کیا یہ متعین کرنے کے لئے کہ حکومت کے ملازمین کی تنخواہیں کیا ہونی چاہئیں۔ سینٹرل سیکریٹریٹ کے ملازمین کا شعبہ مجھ سے متعلق تھا اس لئے ان کی تنخواہوں کے ضمن میں کمیشن سے مذاکرہ کے لئے مجھے متعین کیا گیا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو کمیشن کے چیئرمین جسٹس منیر (مرحوم) تھے۔ وہ بڑی خوش خلقی سے پیش آئے اور مجھ سے کہا کہ آپ کے خیال میں ایک کلرک کی تنخواہ کیا ہونی چاہیئے؟ میں نے کہا کہ محترمی! اس سوال کا تعلق نہ میرے "خیال" سے ہے نہ آپ کے خیال سے۔ یہ خیالی بات ہے ہی نہیں۔ اس کا تعلق زندگی کی عملی ضروریات سے ہے اس لئے اس کا جواب حقائق کی روشنی میں عملی طور پر متعین ہونا چاہیئے۔

اُنہوں نے کہا کہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ذرا وضاحت کر دیجئے۔

میں نے کہا کہ بات بالکل صاف ہے۔ جب کوئی شخص ملازمت کے لئے آتا ہے تو اس سے ایک فارم پُر کرایا جاتا ہے جس میں لکھا ہوتا ہے کہ میں "چوبیس" گھنٹے کا ملازم سرکار ہوں۔ دورانِ ملازمت، میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے مجھے کچھ آمدنی ہو"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسے اس کے پابند کر دیتے ہیں کہ اس کا ذریعۂ معاش صرف اس کی تنخواہ ہوگی۔ اس سے واضح ہے کہ یہ تنخواہ اتنی ہونی چاہیئے جس سے اس کا اور اس کے بال بچوں کا گزارہ ہو جائے۔ اگر یہ تنخواہ ان کی کفالت کے لئے کافی نہ ہوئی تو وہ سانپ کے بچے تو ہیں نہیں جو مٹی کھا کر گزارہ کر لیں گے۔ اسے اس کے لئے ناجائز ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے۔ اور اس کی روک تھام کے لئے آپ کو رشوت اور بدعنوانی کے انسداد کے محکمے

قائم کرنے ہوں گے۔

اراکینِ کمیشن کے چہروں کے آثار اس کے غماز تھے کہ وہ کوئی انوکھی بات سن رہے ہیں!

اُنہوں نے کہا کہ ان کی ضروریات کا تعین کیسے ہوگا؟

میں نے کہا کہ یہ بالکل آسان ہے۔ یہ فرض کر کے کہ وہ (مثلاً) میاں بیوی اور دو بچوں پر مشتمل ایک مختصر سا کنبہ ہے، ہم ان کی کھانے پینے کی ضروریات کا تعین کئے لیتے ہیں۔ پھر بازار چل کر دکانداروں سے دریافت کر لیتے ہیں کہ وہ ضروریات کتنے میں پوری ہو جائیں گی۔ ان کی جو میزان آئے وہ اس کی کم از کم ابتدائی تنخواہ ہونی چاہیئے۔ پھر جوں جوں اس کا کنبہ بڑھتا جائے یا اشیائے ضروریہ کے نرخ زیادہ ہوتے جائیں، اسی نسبت سے اس کے مشاہرہ میں اضافہ ہوتا جائے۔ یہ ہونا چاہیئے تنخواہیں مقرر کرنے کا معیار۔

اُنہوں نے اسے خاموشی سے سُنا اور رسمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ آپ کی تجویز پر غور کیا جائے گا، اور عند الضرورت آپ کو پھر تکلیف دی جائے گی۔

اس "پھر تکلیف دینے" کی ضرورت نہ محسوس کی گئی

شام کے وقت ہمارے سیکرٹری صاحب نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ تم کمیشن کے ہاں گئے تھے تو وہاں کیا بات ہوئی تھی؟ میں نے کہا کہ کیوں! خیر باشد؟؟ کہا کہ اُنہوں نے کہا ہے کہ آپ نے کس شخص کو بہرِ گفتگو بھیجدیا؟ وہ تو کمیونسٹ نظر آتا ہے!

جب میں نے اسے بتایا کہ کمیشن کے ساتھ میری کیا بات ہوئی تھی، تو وہ (طنز آمیز انداز سے) ہنس کر کہنے لگا کہ "پھر تو وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں" وہ سیکرٹری انگریز تھا۔

میں کمیشن کو اور پھر سیکرٹری صاحب کو کیسے سمجھاتا کہ میں نے جو کچھ کہا تھا وہ کمیونزم نہیں، اسلام تھا۔ جب حضور نبی اکرمؐ (اور آپ کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ) نے پہلے پہل افرادِ معاشرہ کے وظائف مقرر کئے ہیں، تو ان کا معیار یہی تھا۔ یہ اساسی اصول کہ "ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام اور اس کی ضروریات کے مطابق کفالت" (جسے کمیونزم کا طرۂ امتیاز قرار دیا جاتا ہے) حضورؐ ہی کا متعین فرمودہ تھا۔

بہرحال، یوں مجھے کمیونسٹ قرار دیا گیا تھا۔

چند دنوں کے بعد ملازمین کے سپے سکیلز (تنخواہوں کے درجات) کا اعلان ہو گیا جس کی رُو سے ایک کلرک کی تنخواہ کا سکیل غالباً (۱۲۰ - ۲ - ۶۰) مقرر کیا گیا۔ یعنی ساٹھ روپے سے ابتداء، دو روپے سالانہ ترقی، اور پچیس تیس سال کی ملازمت کے بعد -/۱۲۰ روپے منتہیٰ۔

اور پھر تھوڑے سے ہی عرصہ بعد، محکمہ رشوت ستانی کا انعقاد عمل میں آگیا ـــــــ اور یہ ریس (RACE) اب تک جاری ہے۔ احتیاج سے اس کی ابتداء ہوتی ہے۔ پھر حرص دامنگیر ہو جاتی ہے اور آخر میں تکاثر اس کی رفتار کو تیز سے تیز تر کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک حضورؐ کا یہ ارشادِ گرامی معاشی نظام کی خشتِ اوّل قرار نہیں پاتا کہ

جس بستی میں کوئی ایک فرد بھی رات کو بھوکا سو گیا اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ

ختم ہو گیا۔

اور حضرت عمرؓ کے اس اعلان سے اس کی تکمیل نہیں ہوتی کہ

اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہو گی۔

کمیونزم تو اس منزل کی گرد تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر میں نے، قرآنِ کریم کے معاشی نظام کو پیش کرتے ہوئے، ایک مقالہ کا عنوان یہ قائم کیا تھا کہ

جہاں مارکس ناکام رہ گیا اُس سے آگے

یہ مقالہ اب میری کتاب، نظامِ ربوبیت" میں شامل ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ کمیونزم کو تو سرے سے کہیں نافذ ہی نہیں کیا گیا۔ اس کی جگہ روس اور چین میں سوشلزم کو بطور معاشی نظام استوار کیا گیا۔ وہاں یہ نظام بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ روس تو نظامِ سرمایہ داری کے قریب آپہنچا ہے۔ چین کے متعلق میں نے (ماؤزے تنگ کی زندگی میں) لکھا تھا کہ وہاں یہ نظام ماؤ کی زندگی تک رہے گا۔ بعد میں ختم ہو جائے گا کیونکہ اس کی بنیاد شخصیت پرستی پر رکھی گئی ہے۔ ان سطور کی تحریر کے وقت، امریکن نیوز ویک کی ۴ اکتوبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میرے سامنے ہے۔ اس میں بصراحت لکھا ہے کہ وہاں ماؤ اور اس کی اختیار کردہ مختلف سکیموں کی کس قدر شدید مخالفت ہو رہی ہے۔

دنیا میں کوئی معاشی نظام کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ قرآن کی بنیادوں پر استوار نہ ہو۔ اس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ "مذہب" ہے جو نظامِ سرمایہ داری کی سپر اور ملوکیت کا باڈی گارڈ ہوتا ہے۔

(۰)

۲۔ کیا ہم تباہی سے بچ جائیں گے؟

سوال:۔ مسلم ممالک اس وقت نکبت و زبوں حالی کے جن عمیق گڑھوں میں گر چکے ہیں، کیا وہ ان سے نکل سکیں گے؟..... قرآنِ مجید اس باب میں کیا کہتا ہے؟

پرویز

قرآنِ کریم کی رُو سے، کوئی قوم نہ تو یونہی زوال پذیر اور پھر مُردہ ہو جاتی ہے، نہ ہی یونہی عروج آشنا۔ قوموں کے عروج و زوال کے لئے غیر متبدل قوانین مقرر ہیں۔ زوال آمادہ قوم، اگر وہ اُس مقام تک نہیں پہنچ چکی جہاں اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی، تو وہ عروج و ارتقاء کے قوانین کے مطابق اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لینے سے پھر حیات آشنا ہو سکتی ہے۔

قوموں کو اُن کے نظریۂ حیات اور نظامِ زندگی کی رُو سے تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) وہ قوم جو علم و بصیرت کی رُو سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحیٔ خداوندی کی روشنی میں

عالم گیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کرتی ہے۔ یہ قوم جب تک اس روش پر قائم رہتی ہے دنیا کی کوئی دوسری قوم اس پر غالب نہیں آسکتی۔ قرآن کے الفاظ میں یہ جماعتِ مومنین ہوتی ہے جسے اَعْلَوْنَ کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ اسی کو الذین کی حامل قوم کہا جاتا ہے۔

(۲) مذہب کو چھوڑ کر جو قوم عقل و علم کی رُو سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے، انہیں اپنے گروہ بندانہ مقاصد کے لئے صرف کرتی ہے، اس کا مقابلہ اسی جیسی دوسری قوموں کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ جو قوم اس سے زیادہ قوتیں فراہم کر لیتی ہے وہ اس پر غالب آجاتی ہے۔ ان اقوام کو سیکولرازم کی حامل کہا جاتا ہے۔ تاریخِ عالم، سیکولرازم کی اسی گردشِ دولابی کی داستان ہے۔

(۳) جو قوم علم و عقل سے کام نہیں لیتی، اس کے لئے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اپنی طبیعی زندگی کی ضروریات کے لئے بھی دوسری قوموں کی دست نگر ہوتی ہے۔ یہ بات بالادست قوموں کی مصلحت پر موقوف ہوتی ہے کہ اس (زیر دست) قوم کو کب تک زندہ رہنے دیا جائے۔ یہ قومیں نہ اپنی زندگی جیتی ہیں نہ اپنی موت مرتی ـــــ انہیں مذہب پرست اقوام کہا جاتا ہے۔ یہ جبتک مذہب کے ساتھ چمٹی رہیں گی، پستی اور زیردستی کی اسی ذلت آمیز حالت میں رہیں گی۔

اگر کسی ایسی قوم کے دل میں زندگی اور عروج کی خواہش بیدار ہو، اور وہ اقوامِ عالم میں بلند ترین مقام پر پہنچنا چاہے تو اسے مذہب چھوڑ کر قرآن کا اتباع کرنا ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنے اندر اس کی ہمت نہ پائے تو اسے مذہب چھوڑ کر سیکولرازم اختیار کر لینا ہوگا۔ اس صورت میں وہ مقامِ مومن پر نہیں تو کم از کم مقامِ آدم پر پہنچ جائے گی۔ مذہب تو مقامِ آدم سے بھی پست تر مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ اس میں عقل و فکر کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے۔ وہ علومِ سائنس کی تحصیل کو کفر و الحاد قرار دیتی ہے۔ ایسی اقوام کو چمگادڑ کی طرح تاریکی ہی راس آتی ہے۔

ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ اگر وہ قوم اپنے اندر اتباعِ قرآنی کی ہمت نہ پائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اتباعِ قرآنی اس قدر مشکل ہے کہ اس کے لئے صبر آزما ہمت کی ضرورت ہوتی ہے؟

اتباعِ قرآن تو اس قدر ہمت طلب نہیں ہوتا لیکن جن عقائد و مسالک کو چھوڑ کر قرآن خالص تک آنا ہوتا ہے، ان کو چھوڑنا بڑا ہمت طلب ہوتا ہے۔ یہ عقائد و مسالک ایسی قوم کے ہاں صدیوں سے متوارث چلے آتے ہیں ـــــ تمدن، تصوف، شریعت، کلام ـــــ ان سب کو چھوڑ کر قرآن کی طرف آنا پڑتا ہے۔ کٹھن منزل لا کی ہوتی ہے۔ مذہب پرست قومیں اسی منزل میں کھوئی رہتی اور فنا کے گھاٹ اُتر جاتی ہیں۔

یہ تو رہا آپ کے سوال کے اس حصّے کا جواب کہ ایک مردہ قوم حیاتِ تازہ سے ہمکنار ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اب رہا یہ کہ کیا موجودہ مسلمان اقوام جو مذہب کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں، ایسا کر سکیں گی، تو اس کا جواب دینا مشکل ہے ـــــ مشکل اس لئے کہ، کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی قوم کل کو کیا روش اختیار کرے گی؟ کیا چند سال پہلے کوئی تصوّر بھی کر سکتا تھا کہ یہودیوں جیسی قوم اس قدر

قوت حاصل کرلے گی۔ جہاں تک مسلمان ممالک کا تعلق ہے، قیاس یہی کہتا ہے کہ وہ زندہ قوموں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔

جس قوم کا مذہب دُوربین کے ذریعے چاند دیکھنے کو بھی ناجائز قرار دے، وہ چاند کو مسخر کیسے کر سکتی ہے؟ اس کا دانشور طبقہ ایسا چاہے بھی تو مذہبی پیشوائیت کی ہنگامہ خیزی اُسے اس کی جرأت نہیں دلائے گی ——— لہٰذا، وہ طبقہ سیکولرازم اختیار کرلے گا۔ پہلے سیکولرازم ان کے سینوں کے اندر پرورش پائے گا۔ پھر نمودار ہو جائے گا۔ سُپر پاورز کی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ مسلمان ممالک میں مذہب کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، ان کا مفاد اسی میں ہے کہ

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

(۰)

ناطقۂ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

طلوعِ اسلام کی اشاعت (بابت اکتوبر ۱۹۸۲ء) میں ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔ "فاروقیت کیا ہے؟" اس مقالہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کا پمفلٹ بھی شائع کیا گیا، اور اس طرح یہ مقالہ ملک کے گوشے گوشے تک پہنچ گیا۔ لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ روزنامہ "مغربی پاکستان" نے اپنی ۱۴ر اکتوبر کی اشاعتِ خاص میں، اس مقالہ کو (کم و بیش) لفظاً لفظاً نقل کر دیا ہے۔ لیکن اس میں کہیں طلوعِ اسلام کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ اس کے بجائے "ترتیب و تدوین۔ نواز چوہدری" لکھا گیا ہے۔

مقالہ اس طمطراق سے شائع کیا گیا ہے کہ اخبار مذکور کے صفحہ اوّل پر نہایت شوخ رنگ میں، انتہائی جلی قلم سے "فاروقیت" لکھا ہے اور سارا مقالہ رنگین روشنائی سے چھاپا گیا ہے۔ (اس اشاعت میں، مقالہ کا قریب ایک تہائی حصہ شائع کیا گیا ہے۔ بقایا شاید کسی دوسری اشاعت میں چھاپا گیا ہو!)۔ یہ ہے ہماری صحافت!

ہم روزنامہ مغربی پاکستان، اور چوہدری نواز صاحب کی خدمت میں صرف اتنا عرض کریں گے کہ طلوعِ اسلام کا مقالہ ملک کے گوشے گوشے تک پہنچ چکا تھا۔ جنہوں نے اُسے پڑھا تھا وہ جب اسے "مغربی پاکستان" میں (بالحوالہ) دیکھیں گے تو ان کی نظروں میں آپ کی کیا وقعت رہ جائے گی، اس کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے ——— ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

(۰)

حقائق و عبر

۱۔ مفتی صاحب! ذرا احتیاط کیجئے

آجکل ہمارے روزناموں میں ایک کالم "دینی مسائل" کے لئے بھی مخصوص ہوتا ہے جس میں عوام کے استفسارات، اور کسی مفتی صاحب کی طرف سے ان کے جوابات درج ہوتے ہیں۔ روزنامہ جنگ (لاہور) کے جمعہ میگزین (بابت ۵ تا ۱۱ نومبر ۱۹۸۲ء) میں "ایک دکھی لڑکی" کے نام سے ایک خط شائع ہوا ہے جس کا جواب مولانا عبدالرحمٰن۔ جامعہ اشرفیہ، لاہور، کی جانب سے چھپا ہے۔ یہ داستان اس ایک "دکھی لڑکی" کی نہیں۔ اس قسم کی بے شمار مظلوم لڑکیاں اور عورتیں، ان فتاویٰ کی ستم رسیدگی سے اپنی قسمت کو روتی پھرتی ہیں اور ان کے غم والم کا کوئی مداوا نہیں بتاتا۔ طلوعِ اسلام قریب تیس سال (بلکہ اگر اس کا دورِ اوّل بھی حساب میں رکھ لیا جائے تو) چالیس پینتالیس سال سے ان موضوعات پر لکھتا چلا آرہا ہے۔ اس اعتبار سے، نیز اس لئے بھی کہ اس کا ایک نہایت اہم قانونی پہلو بھی ہے، ہم نے اسے درخورِ اعتنا سمجھا ہے۔ اگر اس "دکھی لڑکی" کا نام اور ایڈریس معلوم ہوتا تو ہم اسے براہِ راست بھی لکھتے جس سے اس کا غم دُور ہو جاتا، لیکن اب طلوعِ اسلام کے اوراق ہی ذریعۂ ابلاغ ہو سکتے ہیں۔ پہلے آپ اس دُکھی لڑکی کا استفسار ملاحظہ فرمائیے۔ وہ لکھتی ہے:۔

میری شادی اپریل ۱۹۸۱ء کو ہوئی۔ میرے خاوند شادی کے بعد ڈیڑھ ماہ رہے پھر واپس مغربی جرمنی چلے گئے۔ ہماری بدقسمتی کہ ہمیں اپنے مذہب کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں خصوصاً طلاق وغیرہ کے بارے میں تو بالکل لاعلم ہیں۔ ہوا یہ کہ ایک دن جب ہماری شادی کو صرف بیس پچیس روز ہوئے تھے، صبح ناشتہ کرتے ہوئے میں نے یونہی بلا ارادہ اپنے شوہر سے کہا کہ "تم مجھے طلاق دے دو"۔ میرے خاوند جو رسالہ پڑھ رہے تھے انہوں نے فوراً کہا کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں"۔ یہ الفاظ انہوں نے تین بار کہے۔ اس بات کو تقریباً دو سال ہو گئے ہیں۔ ہم دونوں کو یہ بات یاد بھی نہیں تھی کہ چند ماہ پہلے میں نے ایک دینی کتاب میں پڑھا کہ خاوند کے تین دفعہ یہ الفاظ کہہ دینے سے طلاق ہو جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لئے حرام ہو جاتے ہیں۔ یہ باتیں پڑھ کر میرے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی رو رو کر بُرا حال ہو گیا ہے۔ اب میرے خاوند چھٹیوں پر آج کل آئے ہوئے ہیں۔ جب میں نے ان کو بتایا تو وہ بھی بہت پریشان ہوئے۔ جنابِ مولانا صاحب! خدا کی قسم ہم دونوں کو اس بات کا علم

نہیں تھا کہ یہ الفاظ کہہ دینے سے اس طرح ہوجاتا ہے۔ ہم دونوں نے صرف مذاق کیا تھا۔
خدا کے لئے جناب مولانا صاحب کتاب و سنت کی روشنی میں ہمیں بتائیں کہ کیا ہم دونوں کو طلاق ہوگئی یا نہیں؛ آپ کا تعلق ذرائع ابلاغِ عامہ سے ہے اس لئے خدارا لوگوں کو زیادہ سے زیادہ طلاق کے بارے میں احکامات سے روشناس کرائیں تاکہ لاعلم لوگ ہم جیسی حماقت نہ کریں۔ میں یقین سے کہتی ہوں کہ ہمارے اسّی نوّے فی صد لوگ طلاق کے احکامات سے لاعلم ہیں۔ ابھی تک ہمارے ہاں کوئی بچہ وغیرہ نہیں ہوا، خدا کے لئے جلد از جلد میرے مسئلہ کا کوئی حل بتائیں مشکور رہوں گی۔ ہمارا فیصلہ آپ کے فتویٰ پر ٹھہرا ہوا ہے۔

اس "دکھی لڑکی" کی روداد غم آپ نے ملاحظہ فرمالی۔ اب مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:۔

ایک ہے یوں کہنا کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں اور ایک ہے تین مرتبہ یہ کہنا کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ اس میں اگر کہنے والے کی نیّت پہلے کلام کو صرف پکا کرنے کے لئے دو مرتبہ اور کہہ دیا کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، تو پھر تو ایک طلاق ہوگی اور اگر یہ نیّت کی کہ ہر مرتبہ کہنا مستقل تھا اور تین کی نیت کرکے تین دفعہ یہ کلام کہا تو پھر تین طلاقیں ہوگئیں۔ پہلی شکل میں خاوند کا پہلے آپ کو دوبارہ بیوی بنا لینا جائز ہے۔ دوسری صورت میں جائز نہیں، بلکہ آپ خاوند پر حرام ہوگئیں۔ اب جب تک آپ کا دوسرا نکاح نہ ہوجائے اور پھر وہ صحبت کے بعد طلاق نہ دے دے پہلے خاوند کے لئے حلال نہیں ہوں گی۔

سب سے پہلے تو آپ یہ دیکھئے کہ "دکھی لڑکی" نے کہا ہے کہ "بدقسمتی سے ہمیں مذہب کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ خصوصاً طلاق وغیرہ کے بارے میں تو بالکل لاعلم ہیں۔" آپ سوچئے کہ کیا اس قسم کی لڑکی (یا میاں بیوی) مولانا صاحب کے فتویٰ سے کچھ بھی سمجھ سکے ہوں گے کہ ان کی مصیبت کا حل کیا ہے؟ لیکن بیچارے (فتویٰ نویس) حضرات معذور ہیں۔ فتووں کی زبان ہوتی ہی ایسی ہے۔

اب آئیے نفسِ مضمون کی طرف۔ ان حضرات کا مسلک یہ ہے کہ

اگر کوئی خاوند اپنی بیوی سے "طلاق۔ طلاق۔ طلاق" کہہ دے تو اس سے ان کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ بیوی اس خاوند پر حرام ہوجاتی ہے۔ اب اگر (کچھ وقت کے بعد میاں صاحب کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے اور) وہ بدستور بہ حیثیت میاں بیوی رہنا چاہیں تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے "نکاح" کرکے ایک شب اس کے ساتھ ہم بستر ہو، صبح کو وہ اُسے طلاق دے دے، تو پھر اپنے اصلی خاوند کے ہاں آسکتی ہے۔ اسے حلالہ کہتے ہیں۔

یہ ان حضرات کی فقہ کا مسئلہ ہے ـــــ اُس فقہ کا جسے اب یہاں اسلامی قوانین کے نام سے نافذ کیا جائے

ہے — اس لئے ہم اس کے خلاف کیا کر سکتے ہیں، بجز اس کے کہ خدا کی کتاب کا دامن اس قسم کے فیصلوں سے یکسر پاک ہے۔ یہ قرآنِ مجید کے صریحاً خلاف ہے۔ اس کی رُو سے نہ اس قسم کی طلاق، طلاق ہوتی ہے، ان کے میاں بیوی بننے کے لئے اس قسم کی شرط۔

لیکن اس کا ایک اہم پہلو اور ہے۔ آجکل، نکاح، طلاق وغیرہ کے بارے میں، پاکستان میں فقہ کے قوانین نافذ نہیں بلکہ وہ ملکی قوانین نافذ اور رائج ہیں جنہیں عائلی قوانین کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مولانا صاحب کا مندرجہ بالا فتویٰ ان قوانین کے خلاف ہے۔ عائلی قوانین کی رُو سے، طلاق کا طریقہ یہ ہے کہ

> اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہو تو طلاق کا اعلان کرنے کے بعد وہ اس یونین کونسل کے چیئرمین کو تحریری طور پر نوٹس دے گا جس کے علاقے میں اس کی بیوی رہتی ہو۔ اس نوٹس کی ایک نقل وہ اپنی بیوی کو بھی مہیا کرے گا۔ اگر وہ ایسا کرنے سے قاصر رہے تو وہ سزا کا مستوجب ہو گا۔ (ایک سال تک قید یا پانچ ہزار روپے تک جرمانہ، یا دونوں سزائیں)۔ چیئرمین نوٹس موصول ہونے پر تیس دن کے اندر اندر صلح صفائی کی غرض سے ایک ثالثی کونسل مقرر کرے گا جس میں فریقین کے نمائندے شامل ہوں گے۔ اگر اس کونسل کی تمام کوششوں کے باوجود فریقین میں صلح صفائی نہ ہو سکے تو مقررہ ضابطہ کے مطابق نوّے دن کی عدّت کے بعد طلاق مؤثر ہو گی۔[1]

ظاہر ہے کہ مولانا صاحب کا فتویٰ اس قانون کے خلاف ہے۔ اس امر کا جائزہ لینا اربابِ حکومت کے لئے ہے کہ ملکی قوانین کے خلاف فتاویٰ دینے کی روک تھام کے لئے کیا کارروائی کی جانی چاہیئے۔

اب اس کے عواقب کی طرف آیئے۔

(۱) اس قسم کے فتوے کے بعد، متعلقہ شوہر یہ سمجھنے میں حق بجانب ہو گا کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے اور وہ اب اس کی بیوی نہیں رہی۔ یہ، عائلی قوانین کی مندرجہ بالا شق کے خلاف ہے جس کے لئے اسے ایک سال قید یا پانچ ہزار روپے جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جا سکتی ہیں۔

(۲) اس فتویٰ کی رُو سے جب وہ سمجھ لے گا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہے تو دوسری شادی کرنے کے لئے اپنے آپ کو آزاد تصوّر کرے گا۔ اگر اس نے اس تصوّر کے تحت دوسری شادی کر لی تو یہ جرم ہو گا جس کی پاداش میں ایک سال قید۔ یا پانچ ہزار روپیہ تک جرمانہ، یا دونوں سزائیں دی جا سکتی ہیں۔

(۳) خاوند کی طرح بیوی بھی یہ تصوّر کر سکتی ہے کہ وہ سابقہ خاوند کے حبالۂ نکاح سے آزاد ہو چکی ہے۔ اور بلا مشروط کسی دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے۔ اگر اس نے ایسا کر لیا تو قانون کی رُو سے وہ

---

[1] ہم نے یہ قاعدہ، سنہ ۱۹۶۱ء کے آرڈی نینس کے زیرِ تابع قوانین سے نقل کیا ہے۔ آرڈی نینس ابھی تک نافذ ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کے قواعد و ضوابط میں کوئی جزئی تبدیلی ہو گئی ہو۔ اس کی بابت متعلقہ کونسل یا کسی وکیل سے دریافت کر لینا چاہیئے۔

" نکاح پر نکاح " کے جرم کی مجرم قرار پائے گی۔ اور اس کی سزا ظاہر ہے۔ ایسی صورت میں تو وہ مولوی صاحب بھی ساتھ ہی دھر لئے جائیں جنہوں نے یہ دوسرا نکاح پڑھایا تھا۔ کیونکہ یہ عورت قانوناً مطلقہ نہیں تھی۔

ہم محترم مولانا عبدالرحمٰن صاحب (اور ان کے ہم مشرب دیگر مفتی صاحبان) کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ جب تک ملک میں عائلی قوانین نافذ ہیں، وہ ایسے فتوے دینے سے احتیاط برتیں جو ان قوانین کے خلاف جاتے ہوں۔

اور اس کے ساتھ ہی ہم مؤقر ہمعصر (روزنامہ جنگ۔ اور اسی انداز کے دیگر جرائد و مجلات) سے بھی مشورۃً عرض کریں گے کہ وہ اپنے کالموں میں اس قسم کے فتاویٰ یونہی شائع نہ کر دیا کریں۔ اگر اس قسم کا کوئی کیس (مقدمہ) عدالت میں دائر ہو گیا تو ممکن ہے کہ متعلقہ مفتی صاحب کے ساتھ وہ بھی لپیٹ میں آ جائیں۔ بقول غالب ؎

بچتے نہیں مؤاخذۂ روزِ حشر سے
قاتل، اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

باقی رہیں اس قسم کے مسائل کے متعلق معلومات، تو اس کے لئے (زیادہ نہیں تو کم از کم) پرویز صاحب کی تصنیف " طاہرہ کے نام خطوط " دیکھ لینی چاہیئے۔

(۰)

۲ - (۶۵) من عرقِ گلاب

روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

آج حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ کے (۹۳۶) ویں سالانہ عرس مبارک کے سلسلہ میں ان کے مزار کو غسل دینے کی رسم ادا کی گئی۔ صوبائی وزیر اوقاف میاں ذاکر قریشی اور دیگر عمائدین نے تقریباً (۶۵) من عرقِ گلاب سے مزار کو غسل دیا......
غسل کی تقریب کے بعد عقیدت مندوں نے عرق گلاب کو بوتلوں میں جمع کر لیا اور کچھ نے اسے اپنے کپڑوں پہ چھڑک لیا۔

عرق گلاب (علاوہ دیگر طبی فوائد) آشوبِ چشم کے لئے بڑا مفید ہے۔ غریب مریض، خالص عرق گلاب کے چند قطروں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ باقی رہا " ثواب " کا سوال تو اللہ تعالیٰ نے اس کا ایک ہی معیار بتایا ہے۔ اور وہ یہ کہ

وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ...... (۱۳/۱۷)

بقا اسی عمل کے لئے ہے جو نوعِ انسان کی منفعت کے لئے ہو

(۰)

۳۔ عاشورۂ محرم کا روحانی پہلو

سید اسعد گیلانی صاحب نے (جو کالعدم جماعت اسلامی کے ایک ممتاز رکن ہیں) مندرجہ بالا عنوان سے، روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۲۸ راکتوبر کی اشاعت میں ایک مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے جسے جناب شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی کتاب غُنْیَۃُ الطالبین کے حوالہ سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ اس روز (یعنی دسویں محرم) کی عبادت کا ثواب کس قدر گراں بہا ہے۔ مثلاً "جو کوئی اس دن کا روزہ رکھے اُسے ہزار شہید کا ثواب ملتا ہے اور اسے سات آسمانوں کے برابر اجر عطا کیا جاتا ہے...... جس نے اس روز چار رکعت نماز پڑھی اور ہر رکعت میں ایک بار سورۂ فاتحہ اور پچاس بار سورۂ اخلاص پڑھی تو خداوند تعالیٰ اس کے گذشتہ پچاس سال کے گناہ اور آئندہ پچاس سال کے گناہ معاف فرما دیتا ہے اور فرشتوں کے گروہ میں اس کے لئے نور کے پچاس محل تیار کرائے جاتے ہیں"۔

اس کے بعد اس دن کی عظمت و اہمیت کے متعلق ارشاد ہے:۔

شیخؒ فرماتے ہیں کہ حضور نبی اکرمؐ نے صحابہؓ کے استفسار پر ارشاد فرمایا کہ محرم کے عاشورے کے دن اللہ تعالیٰ نے آسمانوں، پہاڑوں، دریاؤں۔ لوح و قلم۔ اور حضرت آدم (علیہ) کو پیدا کیا اور ان کو بہشت میں داخل فرمایا۔ اور حضرت ابراہیمؑ بھی عاشورے کے دن پیدا ہوئے۔ اور انہوں نے حضرت اسماعیلؑ کو عاشورے کے دن ہی اللہ تعالیٰ کے حکم پر قربان کیا تھا...... یہ بھی کہا گیا ہے کہ فرعون عاشورے کے دن ہی دریائے نیل میں غرق ہو کر واصلِ جہنم ہوا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کا دیرینہ مرض عاشورے کے دن ہی دور فرمایا تھا۔ اور جب حضرت آدمؑ اور حوّا سے بہشت میں دانۂ گندم کے بارے میں لغزش ہوئی اور انہوں نے اس خطا پر توبہ اور گریہ و زاری کی، تو اللہ تعالیٰ نے عاشورے کے دن ہی ان کی توبہ قبول فرمائی تھی۔ حضرت داؤدؑ کی لغزش بھی عاشورے کے دن ہی معاف فرمائی گئی تھی اور حضرت عیسےٰؑ بھی عاشورے کے دن ہی پیدا ہوئے تھے۔ قیامت کا دن بھی عاشورے کا دن ہی ہوگا۔

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ بعض علماء نے کہا ہے کہ عاشورے کے نام کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دن دس نبیوں کو دس کرامتیں عطا فرمائیں جو یہ بیان کی گئی ہیں:۔

(۱) حضرت آدمؑ کی اس روز توبہ قبول کی گئی۔

(۲) حضرت ادریسؑ کو اس روز بلند جگہ پر اٹھا لیا گیا۔

(۳) حضرت نوحؑ کی کشتی طوفان سے گذر کر جودی پر ٹھہر گئی۔

(۴) حضرت ابراہیمؑ اس روز پیدا ہوئے اور خداوند تعالیٰ نے انہیں اپنا دوست بنایا اور نمرود

کی آگ سے نجات دی۔

(۵) اسی روز حضرت داؤدؑ کی توبہ قبول ہوئی اور حضرت سلیمانؑ کو شوکت عطا کی گئی۔

(۶) اسی روز حضرت ایوبؑ کو دکھ درد سے نجات ملی۔

(۷) اسی روز حضرت موسےٰؑ کو دریا سے پار اتارا اور اسی روز فرعون کو غرق دریا کیا گیا۔

(۸) اسی روز حضرت یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ سے نجات دی گئی۔

(۹) اسی روز حضرت عیسےٰؑ کو آسمان پر اٹھایا گیا۔

اور آخری بات یہ کہ

(۱۰) اسی روز حضورؐ نبی اکرم دنیا میں تشریف لائے۔

معلوم نہیں اب (۱۲) ربیع الاوّل کو کونسی تقریب منائی جائے گی کیونکہ حضورؐ کی پیدائش کا دن تو عاشورہ (دس محرم) بتایا گیا ہے۔

اسے بھی سُن لیجئے کہ کتاب غنیۃ الطالبین کے مصنف حضرت شیخ عبد القادرؒ جیلانی (پیر دستگیرؒ) ہیں جو سرخیل اولیائے کرام اور زبدۃ صوفیائے عظام ہیں اور اسے پیش کرنے والے اس کالعدم جماعتِ اسلامی کے ممتاز رکن ہیں جو پاکستان میں اقامتِ دین کی مدعی ہے۔

---(o)---

۴- بائیبل میں جدید تحریف

پرویز صاحب نے اپنی محققانہ تالیف (مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں) میں بتایا ہے کہ (علاوہ دیگر مذاہب) یہودیوں اور عیسائیوں کی متینہ آسمانی کتاب (بائیبل- عہدنامہ قدیم وعہدنامہ جدید) کس طرح مرتب ہوئی اور اس میں کس قدر تحریف کی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تحریف کا یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے اور اب ان کتابوں کے ساتھ جو کچھ کیا جارہا ہے وہ تحریف نہیں بلکہ یکسر تنسیخ ہے۔ امریکہ سے شائع ہونے والے میگزین (TIME) نیز (NEWS WEEK) کی اشاعت بابت ۴ اکتوبر ۱۹۸۲ء میں اس تنسیخ کی روئداد شائع ہوئی ہے جو بڑی دلچسپ ہے۔ ریڈرز ڈائجسٹ ایک بین الاقوامی شہرت کا حامل رسالہ ہے۔ اس نے قریب پانچ سال قبل، بائیبل کے ایک جدید اڈیشن شائع کرنے کی سکیم شروع کی تھی۔ اب وہ بائیبل شائع کردی گئی ہے۔ اس میں بائیبل کے عہدنامہ عتیق (تورات) کا نصف حصہ حذف کردیا گیا ہے۔ اور عہدنامہ جدید (انجیل) کا ایک چوتھائی حصہ ——— چنانچہ (بقول ان کے) یہ ہلکی پھلکی بائیبل بڑی مقبول ہو رہی ہے۔

یہ ہے حقیقت ان کتابوں کی جن کے پیرو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہدایتِ خداوندی کے متبع ہیں۔ یاد رکھئے اس آسمان کے نیچے، خدا کی طرف سے نازل شدہ صرف ایک کتاب ہے جس کا ایک حرف تک کا بھی ردّ و بدل نہیں ہوا ——— اور وہ ہے قرآن مجید۔

۵۔ ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو!

عراق اور ایران کی جنگ قریب دو سال سے جاری ہے۔ ہم نے اس موضوع پر آج تک کچھ نہیں لکھا۔ اس لئے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم لکھیں تو کیا لکھیں؟ قرآنِ کریم میں تو ہے کہ "جس نے کسی ایک مسلمان (مومن) کو بھی عمداً قتل کر دیا تو اس پر خدا کا غضب ہے۔ اس کی لعنت ہے۔ وہ سیدھا جہنم میں جائے گا اور عذابِ عظیم میں ماخوذ ہوگا۔" (۴/۹۳) اور یہاں مسلمانوں کے بالمقابل مسلمان ہیں۔ اور دونوں بڑے فخر سے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے فریقِ مقابل کے اتنے افراد کو قتل کر دیا۔ اس وقت ہمارے سامنے اس جنگ کی پیدا کردہ تباہی کی ایسی تفصیل آئی ہے جسے دیکھ کر ہماری روح کپکپا اٹھی ہے۔ یہ شائع ہوئی ہے امریکہ کے میگزین (TIME) کی ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں۔ اس نے لکھا ہے کہ

> اس دو سال کے عرصہ میں، فریقین کے قریب دو لاکھ سپاہی قتل کر دیئے گئے۔ اور قریب ستر ہزار قید کر لئے گئے۔

ان قیدیوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا گیا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

> ایران کے اسلامی گارڈ، عراقی قیدیوں کے ایک گروہ کو (امام) خمینی کی تصویر کے سامنے لے گئے اور ان سے کہا گیا کہ وہ (امام مذکور) کی توصیف و تعریف میں نعرے بلند کریں۔ انہوں نے اس سے انکار کیا تو ان کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیئے گئے۔ جہاں وہ کھڑے تھے اس کے ساتھ ہی پیچھے بہت بڑا گڑھا کھودا گیا۔ قیدیوں کی قطار پر باڑھ ماری گئی، اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے گڑھے میں جا گرے۔

رپورٹ میں اس قسم کے اور واقعات بھی مذکور ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان واقعات میں کچھ مبالغہ بھی ہو لیکن یہ تو حقیقت ہے کہ اس جنگ میں لاکھوں جانیں تلف ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔

ہم نہ عراقیوں کے حلیف ہیں نہ ایرانیوں کے حریف۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسلام کا نہ اس جنگ سے کوئی واسطہ ہے، نہ اس قسم کے ہولناک حوادث سے کوئی تعلق۔ لیکن چونکہ یہ دونوں متحارب قومیں اپنے آپ کو اسلام کی پیرو کہتی ہیں اس لئے دنیا کی نگاہوں میں تو اسلام ہی بدنام ہو رہا ہے!

آپ کو معلوم ہے کہ انسانی جانوں کے اس قدر اتلاف اور مال و دولت، وقت، توانائی کے ضیاع کی وجہ کیا ہے؟ نہ معلوم ہو تو سن لیجئے۔ کسی زمانے میں، کسی نے کرۂ ارض کے نقشے پر چند لکیریں کھینچ دیں۔ ان لکیروں میں گھرے ہوئے ایک خطہ کا نام ایران رکھ دیا دوسرے کا عراق۔ یہ الگ الگ مملکتیں بن گئیں اور ان کے اندر بسنے والے بنی آدم (انسان) الگ الگ قومیں۔ ایران کو اعتراض ہے کہ عراق نے ان کے خطۂ زمین کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا ہے۔ اسی قسم کا اعتراض عراق کو ہے۔ اور اسی سے دونوں آغشتۂ خاک و خون ہو رہے ہیں۔

کرۂ ارض پر لکیریں اور ان لکیروں کے اندر بسنے والے انسان الگ الگ قومیں —— یہ سیکولرازم کی تقسیم ہے۔ جب ایران اور عراق نے اسلام قبول کیا تھا تو نہ یہ لکیریں باقی رہی تھیں اور نہ ہی یہ الگ الگ قومیں۔ یہ خطے ایک مملکت اور یہ قومیں ایک اُمت بن گئے تھے۔ جب اسلام کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا تو یہ لکیریں پھر سے اُبھر آئیں اور اس کے ساتھ ہی اُمتِ واحدہ، مختلف قوموں میں تقسیم ہو گئی۔ جب تک یہ لکیریں باقی ہیں، یہ خون ریزیاں اور فساد انگیزیاں ختم نہیں ہوں گی ...... ایران، عراق ہی نہیں۔ بلکہ ساری دنیا میں۔

اور یہ لکیریں قرآنی نظام کی باطل شکنی ہی سے مٹ سکیں گی جب صورت یہ ہو گی کہ تمام کرۂ ارض ایک خطۂ زمین اور تمام بنی آدم ایک عالمگیر اُمت بن جائیں گے۔ وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔ اور یوں زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔

(۰)

۶۔ اسلامی جمعیتِ طلبہ کا اجتماع

ابتدائے اکتوبر میں، لاہور (نیو کیمپس کے حوالی) میں اسلامی جمعیت طلبہ کا سالانہ اجتماع ہوا، جس میں (مجلہ ایشیا۔ بابت ۷ نومبر ۱۹۸۲ء میں شائع شدہ روئداد کے مطابق) قریب دس ہزار افراد نے شرکت کی۔ ایک اجتماع میں (کالعدم) جماعتِ اسلامی کے ممتاز رکن، نعیم صدیقی صاحب نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ

> اس وقت ملک میں فوج کے علاوہ اسلامی جمعیتِ طلبہ ہی ملکی سلامتی اور وطن کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ (صفحہ ۱۱)

اس اجتماع میں شرکت کے لئے "تحریکِ اخوان المسلمون کے مرشدِ عام" جناب عمر تلمسانی بھی تشریف لائے تھے۔ اپنی تقریر کے دوران انہوں نے فرمایا:-

> میں تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ پولیس، فوج، علماء، وکلاء، ملازمین اور عوام کے تمام طبقات میں جہاد کا شعور بیدار کریں اور خود بھی جہاد کی تیاری کریں۔
>
> (انہوں نے مزید فرمایا کہ) اس وقت یہ بڑی کربناک حقیقت ہے کہ مسلم ممالک میں ایک بھی حکمران ایسا نہیں جو اپنے یہاں شریعت نافذ کر رہا ہو۔ (صفحہ ۱۳)

(۰)

۷۔ دولتِ خداداد کا مصرف!

روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۸ نومبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے:-

سعودی عرب کے مرحوم شاہ فیصل کے دو بیٹے شہزادہ عبداللہ بن فیصل اور الفیصل بن فیصل

اور ان کے دوست مسٹر ہادی جو ان دنوں سرحد کے نجی دورے پر ہیں، ان کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ اعلیٰ نسل کے بازوں کی خریداری کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ اب تک اس پارٹی نے لاکھوں روپے کے عوض دو باز خرید سے ہیں جبکہ ایسے مزید بازوں کی خریداری کے لئے شاہی خاندان کے افراد ایبٹ آباد پہنچ گئے ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ خیبر ایجنسی کا ایک قبائلی ایجنٹ باز دیکھنے کے لئے انہیں ایبٹ آباد لے گیا ہے۔ جبکہ شاہی خاندان کے اس گروپ نے ایک باز اس قبائلی سے خریدا ہے۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ خرید سے جانے والے دونوں بازوں کی کیا قیمت ہے۔ تاہم بتایا گیا ہے کہ ان میں سے ایک باز کی قیمت سات لاکھ روپے ہے۔

سچ کہا تھا قرآن کریم نے کہ قوموں کی تباہی غریبی اور مفلسی ہی کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ دولت کی فراوانی سے بھی ہوتی ہے۔ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا..... (۲۸/۵۸) "کتنی ہی ایسی قومیں بھی تباہ ہو گئیں جنہیں دولت کی فراوانی حاصل تھی"! دولت کو اگر اقدارِ خداوندی کے ساحلوں کا پابند نہ رکھا جائے تو وہ سیلاب بن جاتی ہے۔ جو سب کچھ لے ڈوبتا ہے۔

(۰)

۸۔ غیر حکیمانہ طریقِ علاج

لاہور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "الاعتصام" کی اشاعت بابت ۲۴ ستمبر تا یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

حکومت اسلامی نظریاتی کونسل کی اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے کہ اخبارات میں جنسی جرائم کی تشہیر پر پابندی عائد کر دی جائے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے کچھ عرصے قبل وزارتِ اطلاعات و مذہبی کو یہ تجویز ارسال کی تھی کہ حکومتِ پاکستان فوری طور پر یہ احکام جاری کرے کہ وفاقی شرعی عدالت اور دیگر عدالتوں میں فیصلہ شدہ یا زیرِ سماعت مقدمات اغوا۔ زنا اور لواطت سے متعلق شواہد، واقعات اور تفصیلات کو اخبارات و رسائل میں اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعے شائع کرنے کی ممانعت ہو۔ البتہ عدالت میں جرم ثابت ہونے پر یا تعزیر کی صورت میں جو سزا دی جائے اس کو شائع کرنے کی اجازت ہوگی، مگر وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ کسی کا فوٹو شائع نہ ہو اور ان مقدمات کی سماعت بند کمرے میں ہو۔

پتہ چلا ہے کہ اس تجویز کے پس منظر میں کونسل کے چیئرمین جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کے اسلامی ممالک کے دورے کے تاثرات تھے جو انہوں نے کونسل کے اجلاس میں بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان اسلامی ممالک میں عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ پاکستان میں زنا، اغوا اور لواطت کے واقعات بہت زیادہ ہو رہے ہیں۔ دراصل ایسے مقدمات کی تفصیلات کی وسیع پیمانے پر اخبارات میں تشہیر سے پاکستانی معاشرہ متاثر ہو رہا ہے اور اس کے سبب بے حیائی کو

مزید فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اس کے بعد کونسل نے "چیئرمین" کے گرانقدر افکار سے اتفاق کرتے ہوئے یہ تجویز منظور کی تھی کہ جنسی جرائم کی تشہیر پر پابندی عائد کی جائے۔

(روزنامہ "جنگ" لاہور۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۸۲ء)

طلوعِ اسلام اس کے بعد شعبۂ صحت سے متعلق کوئی صاحب اسلامی ممالک کا دورہ کرنے کے بعد یہ رپورٹ اور تجویز پیش کر دیں گے کہ پاکستانی عوام کی خرابیٔ صحت اور کثرتِ امراض کے متعلق جو خبریں اخبارات میں شائع ہو رہی ہیں، وہ پاکستان کی بدنامی کا باعث ہیں، اس لئے ان خبروں کی اشاعت حکماً روک دی جائے۔ اور پھر تعلیم۔ عدلیہ۔ انتظامیہ وغیرہ کے شعبوں سے متعلق ذمہ دار حضرات کی اسی قسم کی رپورٹوں کے بعد ایسی ہی سفارشات! اس سے پاکستان، دوسروں کی نظروں میں ایک مثالی مملکت قرار پا جائے گا!

ہم اس سے متفق ہیں کہ ان جرائم کی خبریں اس طرح شائع نہیں ہونی چاہئیں کہ ان سے فحاشی کو فروغ حاصل ہو اور اس سے بھی متفق کہ مجرموں کے ناموں کی تشہیر نہیں ہونی چاہیئے لیکن یہ کہنا کہ چونکہ ان خبروں کی اشاعت سے اسلامی ممالک میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان میں ان جرائم کی کثرت ہے، اس لئے ان کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی جائے، ہمارے خیال میں بڑا غلط طریقِ علاج ہے۔ اگر ہمارے ہاں ان جرائم کی فی الواقعہ کثرت ہے تو ہمیں ان کی روک تھام کے لئے مؤثر اقدامات کرنے چاہئیں، نہ کہ انہیں چھپانا چاہیئے۔ جرائم کو چھپانے کے نتائج بڑے مضرت رساں ہوتے ہیں۔ ویسے بھی، آجکل ذرائع معلومات اس قدر وسیع اور بلیغ ہو چکے ہیں کہ کسی ملک کی کوئی بات بھی دوسرے ممالک سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ پھر، اس قسم کی سعی لاحاصل سے فائدہ کیا؟

(۰)

۹۔ ملایا میں اسلام

ملیشیا کے متعلق سنا جاتا ہے کہ وہ ایک اسلامی ملک ہے۔ وہاں کے اسلام کے متعلق امریکن میگزین (TIME) کی ۶ ستمبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جو بڑی معلومات افزا ہے اس کا عنوان ہے:

مسلمان کے مقابل مسلمان

اعتدال پسند مسلمانوں کے خلاف فنڈامینٹلوں کے چیلنج نے خوف و ہراس پیدا کر دیا۔

اس عنوان کے بعد متنِ رپورٹ کے مطالعہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بایں ہمہ، ہم اس کے منتخب اقتباسات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہاں مسلمانوں کی دو پارٹیاں ہیں۔ ایک اعتدال پسندوں پر مشتمل ہے جس کا مخفف (U.M.N.O) ہے۔ اور دوسری وہ جو فنڈامینٹل ازم کی تبلیغ کرتی ہے۔ اسے (P.A.S) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اکثریت اوّل الذکر کی ہے اور ثانی الذکر اس قدر قلیل کہ الیکشن میں وہ صرف پانچ نشستیں

حاصل کر سکی تھی۔ لیکن محاذ آرائی کا یہ عالم ہے کہ

قدامت پرستوں نے اعتدال پسندوں کو کافر قرار دے دیا اور یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ ان کا ذبیحہ کھانا حرام ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنے قبرستان بھی الگ کر لئے ہیں۔

گذشتہ سال حکومت نے قدامت پسندوں کے ایک امام کو برطرف کر دینا چاہا تو اس نے الگ ہونے سے انکار کر دیا۔ معاملہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ اس مسجد کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ چنانچہ منظر یہ سامنے آنے لگا کہ

صحنِ مسجد میں، ایک گروہ قیام میں ہے تو دوسرا سجدہ میں۔

وہاں کے وزیر اعظم کے مذہبی مشیر نے کہا ہے کہ

سیاست کو مذہب کے ساتھ ملانے سے بیشتر گاؤں الگ الگ ہو چکے ہیں۔ اس سے آخر الامر پورے ملایا کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی۔ اگر پارٹی پالیٹکس نے ہماری آبادی کے کثیر التعداد اور فعال حصے کو یوں ٹکڑے کر دیا تو یہ ملک مستحکم کیسے رہ سکے گا۔

فنڈامینٹل ازم کا یہی مقصد ہے۔ اس تحریک کو چلایا ہی اس لئے گیا ہے کہ مسلمانوں کے ملکوں میں استحکام نہ پیدا ہو سکے۔

(۰)

۱۰۔ اسلامی فیصلے

محترم جسٹس جاوید اقبال نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا ہے کہ

موجودہ قوانین کے تحت باضمیر مسلمان ججوں کی طرف سے کئے جانے والے فیصلوں کو غیر اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ (روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۲ء)

ہم محترم جسٹس کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ کسی فیصلے کے اسلامی ہونے کا معیار یہ نہیں کہ وہ کسی باضمیر جج کا موجودہ قوانین کی رُو سے دیا ہوا فیصلہ ہو۔ سیکولر نظام میں اگر کسی مقدمہ کا فیصلہ رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو وہ عدل کے تقاضا کو پورا کر دیتا ہے لیکن اسلامی نظام میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ جس قانون کے مطابق فیصلہ دیا گیا ہے وہ قانون بھی اسلامی ہے؟ اور قانون کے اسلامی ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق ہو۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

اگر کوئی قانون کتاب اللہ کے مطابق نہیں تو اس کی رُو سے فیصلہ دینے والا جج کتنا ہی باضمیر کیوں نہ ہو، اس کا فیصلہ اسلامی قرار نہیں پا سکتا۔ اسی لئے قرآن نے انہی ججوں کو صاحبِ عدل کہا ہے جو بِہٖ یَعْدِلُوْنَ (۷/۱۸۱) یعنی جو الحق (کتاب اللہ) کے مطابق فیصلے دیتے ہیں۔

لہٰذا، رائج الوقت قوانین کے مطابق فیصلوں کو اسلامی تصوّر کرنے اور ایسا قرار دینے سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ قوانین بھی اسلامی (کتاب اللہ کے مطابق) ہیں؟ کیا انہوں نے ان قوانین کو اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیا ہے کہ وہ اسلامی ہیں؟

(۰)